دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجہات قرآن حکیم کی جانب منعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبت جاگزیں ہو ـــــ اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کیلئے وقف کر دیں؛

تاکہ

ایک عظیم الشان **قرآن اکیڈمی** کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی ۲

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

رمضان مُبارک کا بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

جس میں

قرآن مجید کے وہ ۵ حقوق جو ہر مسلمان پر حسب صلاحیت و استعداد عائد ہوتے ہیں یعنی:

* ۱ ـــ ایمان و تعظیم
* ۲ ـــ تلاوت و ترتیل
* ۳ ـــ تذکر و تدبر
* ۴ ـــ حکم و اقامت
* ۵ ـــ تبلیغ و تبیین

کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں

انشاء اللہ رمضان المبارک کے دوران چھپ کر تیار ہو جائیگی

● ۱۸ × ۲۲ سائز پر تقریباً ۷۲ صفحات : نیوز پرنٹ پر، آفسٹ کی طباعت میں

قیمت فی نسخہ : ـــ ایک روپیہ

خود بھی پڑھیے اور رمضان مبارک اور عید سعید کے تحفے کے طور پر دوستوں کو پیش کیجیے۔

دار الاشاعت الاسلامیہ - کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور ۲

استقبالِ رمضان

کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ

اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ

ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ

فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ

وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی

سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ

وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ

وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ

سورۂ بقرہ — وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۵ — آیت ۱۸۵

★

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو۔ اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔ (بقرہ - ۱۸۵)

(ترجمہ ماخوذ از 'تدبر قرآن' مولانا امین احسن اصلاحی)

★

استقبالِ رمضان

رمضان کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ:-

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِیِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ یَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ یَا اَیُّھَا النَّاسُ
قَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ شَھْرٌ مُّبَارَکٌ شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ
مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَّقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا مَنْ
تَقَرَّبَ فِیْہِ بِخَصْلَۃٍ مِّنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ
وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْہِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فَرِیْضَۃً فِیْمَا
سِوَاہُ وَھُوَ شَھْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُہُ الْجَنَّۃُ وَشَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ
وَشَھْرٌ یُّزَادُ فِیْہِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِیْہِ صَائِمًا کَانَ
لَہٗ مَغْفِرَۃً لِّذُنُوْبِہٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِہٖ مِنَ النَّارِ وَکَانَ لَہٗ مِثْلُ
اَجْرِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِہٖ شَیْءٌ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَیْسَ
کُلُّنَا یَجِدُ مَا یُفَطِّرُ بِہِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعْطِی اللّٰہُ ھٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا
عَلٰی مَذْقَۃِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَۃٍ مِّنْ مَّاءٍ وَّمَنْ
اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاہُ اللّٰہُ مِنْ حَوْضِیْ شَرْبَۃً لَا یَظْمَاُ
حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّۃَ وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ
وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ
النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْکِہٖ
فِیْہِ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ وَاَعْتَقَہٗ
مِنَ النَّارِ۔

✱ ——— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

★

ترجمہ: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا — اس میں آپ نے فرمایا:- اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالےٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے، اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کیلئے) افطار کرایا تو اسکے گناہوں کی مغفرت اور آتشِ دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا۔ اور اسکو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائیگا، بغیر اسکے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے — آپؐ سے عرض کیا گیا:- یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان حاصل نہیں ہوتا؟ تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے؟) آپؐ نے فرمایا کہ:- اللہ تعالےٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دیگا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اُسکو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کریگا جسکے بعد اُسکو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی۔ تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائیگا — (اسکے بعد آپؐ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتشِ دوزخ سے آزادی ہے۔ (اسکے بعد آپؐ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف و کمی کر دیگا اللہ تعالےٰ اسکی مغفرت فرمائیگا اور اُسکو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دیگا۔

(ترجمہ ماخوذ از معارف الحدیث: مولانا محمد منظور نعمانی)

تزکیہ نفس

مولانا امین احسن اصلاحی

روزہ اور اُس کی روحانی برکات

شہوات اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالےٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے۔ بالخصوص تزکیہ نفس کے جتنے طریقے بھی غلط یا صحیح دنیا میں اب تک اختیار کئے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب و شرائط اسلام کی نسبت زیادہ سخت تھے اسلام دین فطرت ہے اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفس انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زور دار ہیں ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال، ہیجان اور جوشش ہے۔ اس وجہ سے ارادہ کو ان پر قابو پانے کے لئے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجائے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی

تجویزیں سوچیں اور اختیار کیں۔ لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزا میں سے ہیں جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہسوار بڑی ریاضتوں، بڑی مشقتوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لئے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفس انسانی کے یہ سرکش رجحانات منضبط ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوتِ ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدودِ الٰہی کا پابند بنانے کے لئے طاقتور ہو جائے۔ اپنے اس دو طرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ پہلے اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے اس کے بعد اس کی آفات بیان کریں گے۔

رُوحِ ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روحِ ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روحِ ملکوتی کا حقیقی میلان ملاءِ اعلیٰ کی طرف ہے وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرّد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لئے پرواز کرنا چاہتی ہے۔ روح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہشات و شہوات کے مطالبے پورے کرنے سے انسان کو فوری لذت و راحت حاصل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے روح کے مطالبات پورے کرنے سے انسان کو کوئی فوری لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ الٹے اس کے لئے انسان کو اپنی بہت سی فوری لذتوں اور راحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

یہ صورت حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت مدت تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میلانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو نہ صرف یہ کہ اس کی قوتِ پرواز ختم ہو جاتی

ہے بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

روزہ اس صورت حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات و خواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دلچسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روح ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لئے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ لیکن روزے میں دنیا اور لذاتِ دنیا کو ترک کرکے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں جو مشقت اٹھاتا ہے وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترک دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیتِ نفس کے لئے اس کو پسند فرمایا ہے اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لئے جھیلتا ہے کہ اس کی رُوح اس عالم ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالم لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے :-

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے۔ مگر روزہ۔ یہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہئے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس کو (بخاری صفحہ ۲۵۴ ج۱)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم

اور ان کا انقلابی فکر

بروایت : شیخ بشیر احمد صاحب بی اے لودیانوی

[آج سے ٹھیک ایک سال قبل نومبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں ان ہی صفحات میں راقم نے ملت اسلامیہ پاک و ہند میں علی گڑھ اور دیوبند کے مکتبہ ہائے فکر کے تصادم کے ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تھا :-

" دوسری طرف خاکِ دیوبند سے مولانا عبیداللہ سندھی ایسی مجتہدانہ مزاج رکھنے والی شخصیت بھی ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں کیا بھرپور مشاہدہ بھی کیا اور جدید رجحانات کے زیرِ اثر ملت اسلامیہ کے لئے تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے استناد دیوبند کے موجود الوقت مقلدانہ ماحول سے نہیں بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے فلسفہ و تفقہات ہی سے مل سکتا تھا۔"

ساتھ ہی ایک فٹ نوٹ میں عرض کیا گیا تھا کہ :-

" مولانا عبیداللہ سندھی کے واسطے سے حکمت ولی اللّٰہی کی اس شاخ کے غالباً واحد ورنہ کم از کم معروف ترین وارث پاکستان میں پروفیسر محمد سرور ہیں ..."

بعد میں راقم کا تعارف شیخ بشیر احمد لودیانوی بی اے اور ان کے دست راست مولوی مقبول عالم بی اے سے ہوا، تو اندازہ ہوا کہ : ؎

زمن تنہا دریں میخانہ مستم جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ ہم مست!

بلکہ اندازہ ہوا کہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے واسطے سے حکمت ولی اللّٰہی کی اس شاخ کے پاکستان میں اصل علمبردار یہی دونوں حضرات ہیں جو بالکل جنون کی سی کیفیت کے ساتھ قریباً نصف صدی سے

اس نقطۂ نظر کے مطالعے اور نشر و اشاعت کے کام میں منہمک ہیں۔ اس طویل عرصے کے دوران جب کبھی استطاعت ہوئی انہوں نے کوئی پرچہ اردو میں نکال لیا۔ کچھ عرصے تک انگریزی میں بھی ایک پرچہ نکالتے رہے۔ اور اب ایک عرصے سے ۲۲۳- این سمن آباد لاہور میں "ادارہ حکمتِ اسلامیہ" قائم کر کے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کا کام کئے چلے جا رہے ہیں۔

تقریباً چھ ماہ ہوتے کہ اس ادارے کی مطبوعات کا ایک سیٹ "میثاق" میں تبصرے کے لئے موصول ہوا تھا۔ خیال یہ تھا کہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان پر ایک مفصل تبصرہ تحریر فرمائیں گے۔ لیکن ان کی عدیم الفرصتی کے باعث یہ معاملہ ٹلتا رہا۔ بعدۂ پروفیسر صاحب نے ان پر جو نوٹ تحریر کیا وہ ان مطبوعات پر تبصرہ کم اور مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے فکر کا تعارف زیادہ تھا۔ لہٰذا اب اسے ایک علیحدہ مستقل تحریر کی حیثیت سے "تذکرہ و تبصرہ" کے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کے ایک نامور فرزند کا "تذکرہ" بھی ہے اور ان کے نظریات پر "تبصرہ" بھی۔

مطبوعات جو برائے تبصرہ موصول ہوئی تھیں حسب ذیل تھیں :-

۱۔ قرآنی فکرِ انقلاب —— یعنی سورۂ اخلاص اور معوذتین کی حکیمانہ تشریح۔ صفحات : ۴۸ قیمت ۷۵ نئے پیسے

۲۔ قرآنی اصولِ انقلاب۔ یعنی سورۂ عصر کی انقلابی تفسیر، قیمت ۵۰ پیسے
۳۔ قرآنی اساسِ انقلاب۔ یعنی سورۂ فاتحہ کی حکیمانہ تفسیر، " ۲ روپے
۴۔ قرآنی جنگِ انقلاب۔ یعنی سورۂ محمدؐ کی انقلابی تفسیر، " ایک روپیہ ۷۵ پیسے
۵۔ قرآنی دستورِ انقلاب۔ یعنی سورۂ مزمل کی تفسیر، " تین روپے پچیس پیسے
۶۔ قرآنی عنوانِ انقلاب۔ یعنی سورۂ فتح کی تفسیر، " " " " " "
۷۔ محمودیہ یعنی ارشاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ مجددؒ دہلوی مع اردو ترجمہ : از شیخ بشیر احمد لودیانوی ——— قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

تمام کتابچے $\frac{20\times30}{16}$ سائز پر عمدہ سفید کاغذ پر طبع ہوئے ہیں۔ کتابت اور طباعت بھی غنیمت ہے اور قیمت نہایت مناسب۔

پہلی چھ کتابیں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے اپنے انقلابی فکر کی آئینہ دار ہیں۔ جنہیں شیخ بشیر احمد صاحب لودیانوی نے مرتب کیا ہے۔ اور ساتویں کتاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ارشادات کا مجموعہ ہے جسے مولانا سندھی نے مرتب کیا تھا اور جس کا ترجمہ شیخ بشیر احمد صاحب نے کیا ہے ——

[—— یہ وضاحت دوبارہ پیش خدمت ہے کہ ذیل کی تحریر کو ان مطبوعات پر تبصرہ نہیں بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور ان کے انقلابی فکر کا تعارف سمجھا جائے —— اسرار احمد]

مولانا عبید اللہ سندھی جن کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا، موجودہ صدی کے مشاہیر اور مفکرین میں سے تھے۔ ان کی پوری زندگی بڑی عجیب و غریب اور سبق آموز ہے۔ ۱۸۷۲ء میں وہ ایک غریب سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اللہ نے ان پر کرم کیا اور کفر کی ظلمت سے نکال کر اسلام کے نور میں داخل کر دیا۔ کوئی نظّام، کوئی ابو الہذیل، کوئی بشر بن المعتمر، کوئی ثمامہ بن اشرس، کوئی ہشام، کوئی عباد، کوئی جعفر، کوئی محمد اسکافی، کوئی عبد الرحمٰن الاصم، کوئی صالحی، کوئی جاحظ[1] یہ نہیں بتا سکتا کہ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں نہ ان کو شروع ہی سے کسی مسلمان خاندان میں پیدا کر دیا؟ یا سکھوں میں سے انہی کو اس نعمت کے لئے کیوں منتخب فرمایا؟ یہ وہ مقام ہے جہاں سارے فلسفی اور منطقی دم بخود ہیں۔

مولانا نے دیوبند میں تعلیم پائی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے ان کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہیں اپنا معتمد علیہ اور اس جماعت کا رکن بنایا جو انہوں نے ہندوستان میں سیاسی انقلاب برپا کرنے یعنی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بنائی تھی۔ غالباً ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھیؒ کو حضرت شیخ الہند نے افغانستان بھیجا۔ وہاں سے ۱۹۲۰ء میں روس پہنچے اور وزیر خارجہ روس ٹراٹسکی (TROTSKY) سے تبادلہ خیالات کیا۔ جب مولانا نے اسے یہ بتایا کہ قرآن دنیا میں سب سے بڑا منشور انقلاب ہے۔ اس نے دنیا میں ایک عظیم الشان سیاسی اور معاشی انقلاب برپا کیا۔ اسی نے دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ (۱) کائنات کی ہر شے کا خالق، رازق، مالک اور حاکم صرف اللہ ہے۔ (۲) اس لئے زمین کا مالک بھی اللہ ہے۔ دولت کا مالک بھی اللہ ہے۔ انسان زمین اور دولت کا مالک نہیں ہے محض امین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت دراصل امانت ہے۔ خلیفہ دراصل امین اللہ ہے۔ خلافتِ الٰہی میں ہر شے کا مالک اللہ ہے اس لئے مملکت کی ساری چیزیں افراد کو بطور "امانت" استعمال کے لئے دی جائیں گی اور ہر فرد کی حقیقی حیثیت محض "امین" کی ہوگی۔ خلافت کا فرض ہوگا کہ وہ سامان رزق کی تنظیم و تقسیم اس طرح کرے کہ کوئی فرد زندگی کی بنیادی ضروریات —— مکان، غذا، لباس، دوا، تعلیم وغیرہا سے محروم نہ رہے —— تو ٹراٹسکی بہت خوش ہوا اور اس نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا "کیوں مولانا دنیائے اسلام میں وہ مبارک اور خوش نصیب خطۂ ارض کون سا ہے جہاں یہ زندگی بخش قرآنی نظام حکومت رائج ہے؟" مولانا فرماتے تھے کہ فرطِ خجالت سے میرا سر جھک گیا اور میں نے نیچی نگاہ کر کے کہا "جناب مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نظام مسلمانوں کے کسی ملک میں رائج نہیں ہے

[1] یہ اس مسلک اعتزال کے علمبردار ہیں جس کی تعلیم یہ ہے کہ نقل اور عقل میں ہم آہنگی اور تطبیق ممکن ہے۔

مولانا سندھی مرحوم مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور جب ۱۹۴۰ء میں لاہور آئے تو حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے فرمایا کہ اپنے شاگردوں میں سے دو مستعد شاگرد مجھے دے دو تاکہ میں خود انہیں فلسفہ ولی اللّٰہی پڑھاؤں۔ مولانا نے شیخ بشیر احمد اور مولوی خدا بخش کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ مولانا سندھیؒ نے انہیں پڑھانا شروع کیا بلکہ لاہور سے باہر جاتے تو شیخ بشیر احمد کو ساتھ رکھتے۔ چنانچہ جب گوٹھ پیر جھنڈا گئے تو وہاں بھی شیخ بشیر احمد ان کے ساتھ تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی بھی انہیں ساتھ لے گئے۔ اس طرح شیخ بشیر احمد نے مولانا سندھی سے چار سال تک فلسفہ ولی اللّٰہی پڑھا بلکہ لکھا۔ چنانچہ یہ تعلیمات کی شکل میں ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اوائل جنوری ۱۹۴۴ء میں مولانا سندھی نے فکر ولی اللّٰہی کی اشاعت کے لئے ولی اللہ سوسائٹی قائم کی۔ اور اگست ۱۹۴۴ء کو مولانا سندھیؒ کا انتقال ہو گیا۔

مولانا بشیر احمد صاحب نے زیر تبصرہ کتابوں میں مولانا سندھیؒ کی بیان کردہ تفسیر قلمبند کر دی ہے جو حسب ذیل سورتوں پر مشتمل ہے۔ سورہ مزملؑ، مدثرؑ، فتحؑ، محمدؐ، عصرؑ، فاتحہؑ، اخلاصؑ اور معوذتین بخوف طوالت ان تمام کتابوں پر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ لیکن ایک کتاب یعنی قرآنی دستور انقلاب پر مختصر تبصرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے دوسری کتابوں کی نوعیت کا بھی بآسانی اندازہ ہو سکے گا۔

مولانا سندھی کی رائے ہیں (اور ہم اس رائے سے متفق ہیں) قرآن حکیم ایک زبردست پیغام انقلاب[1] کا حامل ہے۔ آنحضرت صلعم نے بنی آدم کو ایک نصب العین عطا فرمایا جسے اقبال کی زبان میں یوں بیان کر سکتے ہیں۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس[2] نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس

[1] ۱۹۴۰ء میں مشہور اشتراکی رہنما مسٹر ایم این رائے نے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں راقم الحروف کی صدارت میں جو تقریر کی تھی اس میں اس نے یہ فقرہ بھی کہا تھا کہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مسلمان جن کی کتاب سب سے بڑا پیغام انقلاب ہے اور جن کا پیغمبر سب سے بڑا حامل انقلاب ہے، آج دنیا میں سب سے زیادہ بے حس و حرکت، جامد اور انقلاب سے بیگانہ ہیں (او کما قال)

[2] راقم الحروف جس زمانے میں مسلم لیگ آنجہانی کا بھاڑ جھونک رہا تھا اس زمانے میں پشاور سے پونا تک ہر جلسے میں اسی شعر کی شرح بیان کیا کرتا تھا اس کے بعد "رقت کا بند" لگایا کرتا تھا کہ اے جملہ فی صد مسلمانو! تم پاکستان کے حق میں ووٹ دو تاکہ تمہارے پنجابی، سندھی، سرحدی اور بنگالی بھائیوں کو ایک خطۂ زمین مل جائے جس میں وہ ایسا نظام حکومت قائم کر سکیں جس کی رو سے سرمایہ داری، زمینداری، جاگیرداری، ٹھیکہ داری، اجارہ داری وغیرہ سب "داریوں" کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ع

کس نباشد در جہاں محتاج کس

نیز آپؐ نے ایک جماعت بنائی جو اس نصب العین پر ایمان لاتی تھی اور اس میں وحدت فکر و عمل پیدا کی۔ اگر افراد کے سامنے کوئی معین نصب العین ہو تو قدرتی طور پر وحدت فکر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ وحدتِ عمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے لکھا ہے ؎

وحدت افکار و کردار آفریں تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

لیکن جب سے مسلمانوں نے قرآن کی تقلید کے بجائے حیوانات کی تقلید شروع کر دی وہ انسانیت سے خارج ہو کر انہی کے زمرے میں شامل ہو گئے اور اسی لئے یہودی ان پر غالب آ گئے۔ اس جماعت کو آپؐ نے ایک پروگرام دیا تاکہ اس پر عامل ہو کر اپنے نصب العین کو حاصل کر سکے۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں کہ "سید الشہدا حضرت عثمان رضؓ کی شہادت تک اسی طرز پر کام ہوتا رہا لیکن اس کے بعد اختلافات رونما ہو گئے اور اس کے نتیجے میں مختلف فتنوں کا ظہور ہو گیا"

اسی لئے حضرت امام الہند کے نزدیک صرف حضرت عثمان رضؓ کی شہادت تک کا زمانہ ہی قابل سند ——— خیر القرون ——— ہے۔

قرآن حکیم نے پہلا انقلاب یہ برپا کیا کہ کسریٰ اور قیصر کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان دونوں سلطنتوں نے (۱) زمین کو ——— اللہ کی زمین کو اپنی ملک قرار دے لیا تھا اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ یہ تھا ان کا وہ جرم جو قرآن کی نگاہ میں ناقابل معافی ہے اور قیامت تک ناقابل معافی رہے گا۔

قرآن نے فرعون پر بھی یہی جرم عاید کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ الآیہ (۲۸۔ ۵و۴) (بے شک فرعون نے ملک مصر میں بہت سر اٹھا رکھا تھا اور وہاں کے باشندوں کے الگ الگ گروہ بنا دیئے تھے ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس قدر ضعیف کر دیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا فسادی تھا اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جو لوگ ملک میں کمزور سمجھے گئے تھے ان پر احسان کریں اور انہی کو سردار بنائیں اور انہی کو سلطنت کا وارث بنائیں۔"

چنانچہ مسلمانوں نے سب سے پہلے قیصر اور کسریٰ ہی سے ٹکر لی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ امراء، جاگیردار، نواب، سرمایہ دار، زمیندار سب مل کر مزدوروں، کسانوں اور اہل حرفہ کو لوٹ رہے تھے بلکہ انہوں نے ان انسانوں کو، جو بقول حضرت فاروق اعظم رضؓ، اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے، اپنا غلام اور اپنی لونڈیاں بنا رکھا تھا۔ ان بدنصیب انسانوں کی

باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی تھی گویا یہ انسان نہ تھے بلکہ حیوان یا از قبیل اثاث البیت تھے!

اس سیاسی گروہ کے ساتھ مذہبی گروہ نے سازباز یا سازش کر رکھی تھی۔ یہ گروہ گرجوں میں ان غریبوں کو آئندہ آسمانی بادشاہت کا وعظ سناتا تھا جس میں غریبوں اور مفلسوں کے لئے دودھ اور شہد کی نہریں رواں ہوں گی۔ بالفاظِ دیگر انہیں برگِ حشیش کا جامِ نافرجام پلاتا تھا[1] اور اپنی حالتِ زار پر قانع رہنے یا صبر کرنے کی تلقین کرتا تھا اور برسرِ اقتدار طبقہ اس گروہ کو وظائف اور تحائف، نذرانوں اور جاگیروں سے نوازتا رہتا تھا۔ غرضیکہ سیاسی اور مذہبی طبقوں کی اس ملی بھگت نے عوام کو کالانعام بنا دیا تھا اور ان کو اللہ کی عطا کردہ تمام نعمتوں سے محروم کر دیا تھا۔

قرآن حکیم نے دنیا کو بتایا کہ یہ زمین اللہ کی ہے[2] اور اس میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے یعنی بلا امتیاز سب انسانوں کے لئے ہے۔ انسانوں کے کسی خاص طبقے کے لئے نہیں ہے اس لئے ہر شخص کو اس میں سے اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملنا چاہئیے۔ محتاجوں کی امداد کے لئے قرآن حکیم نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا۔ لیکن زکوٰۃ کا موجودہ نصاب اس زمانے میں مقرر ہوا تھا جب بیت المال عوام کی معاونت کے لئے موجود تھا۔ پس بقول علامہ ابن حزم اگر مسلمانوں کی زکوٰۃ کی آمدنی افراد کی خبرگیری کے لئے ناکافی ہو تو حکومت سرمایہ داروں اور دولتمندوں سے جس قدر بھی ضرورت ہو، وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔

قرآن حکیم نے دنیا میں انقلاب برپا کرنے سے پہلے اپنے متبعین کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کیا کیونکہ جب تک کسی انسان کے باطن میں انقلاب رونما نہ ہو وہ اپنے ماحول میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (یعنی اللہ تعالےٰ کسی قوم کے ظاہری حال میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی باطنی حالت میں تبدیلی پیدا نہ کرے) اس کا کچھ اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضہ کے اس جواب سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ایرانی سپہ سالار کے قاصد کو اس کے اس سوال کا دیا تھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟

"ان اللہ ارسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجہالۃ وجور الملوک الی نور الایمان وعدل الاسلام"

[1] ایسی حقائق کو دیکھ کر کارل مارکس نے یہ کہا کہ مذہب غریبوں کے حق میں بمنزلہ افیون ہے۔ اس کے زمانے میں یورپ میں دو ہی مذہب تھے جن کے متبعین حکومت کر رہے تھے اور دونوں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس رہے تھے اور کنیزوں سے اپنے محلات کو آباد کر رہے تھے اور مذہب کے علمبردار عوام الناس کو طرح طرح کی لوریاں دے کر تھپک تھپک کر سلا رہے تھے!

[2] اس سے بڑھ کر ہوگا کیا فکر و عمل کا انقلاب　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں　(اقبال)

یعنی ہم از خود نہیں آئے بلکہ ہم اللہ کی فوج (حزب اللہ) کے سپاہی ہیں اور اسی نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم انسانوں کو (خواہ وہ ایران میں ہوں یا روم میں) جہالت کی تاریکیوں اور بادشاہوں کے ظلم سے نکالیں۔ اور ان کو ایمان کے نور اور اسلام کے عادلانہ نظامِ زندگی میں داخل کریں۔

یہ ذہنیت تھی جو قرآن نے ان مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی جنہوں نے اسے سمجھ کر پڑھا تھا۔ لیکن جب "حقیقت خرافات میں کھو گئی" یعنی "یہ امت روایات میں کھو گئی" تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اسی قرآن کے علمبردار اس زمانے کے قیصر اور کسریٰ (امریکہ اور روس) کے دروازوں پر جا کر مالی امداد کی بھیک مانگ رہے ہیں اور اپنی وفاداری کا واسطہ دے کر اس بھیک میں اضافے کے طلب گار ہوتے ہیں۔

قصہ کوتاہ مولانا سندھی رحمہ نے قرآن حکیم کی مذکورہ بالا سورتوں کی تفسیر اس نہج سے کی ہے کہ پڑھنے والے پر یہ حقیقت عیاں ہو سکتی ہے کہ قرآن حکیم در اصل انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے کا مکمل پروگرام ہے چنانچہ اس کی پوری تفصیل قرآنی اصول انقلاب یعنی سورۃ عصر کی تفسیر میں دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآنی انقلاب کو وہاں لایا گیا۔ قرآن حکیم کے اس انقلابی پروگرام ہی سے ایسا نظامِ حکومت قائم ہو سکتا ہے جس میں کوئی شخص کسی کا محتاج یا دست نگر نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد نہ ہو وہ حقیقی معنی میں موحد یعنی اللہ کا بندہ بھی نہیں بن سکتا۔ چونکہ مسلمانوں کے کسی ملک میں قرآنی نظام نافذ نہیں ہے۔ اس لئے مسلمان زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ "اے اللہ ہم صرف تیری اطاعت کرتے ہیں" لیکن عملاً وہ اپنے حاکموں کی اطاعت کرتے ہیں۔ بقول اقبال

قوتِ فرماں روا معبودِ او　　در زبانش دین و ایماں سودِ او
دین او عہدِ وفا بستن بغیر　　یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

نوٹ: مولانا سندھی مرحوم یہ چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کو نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور چونکہ اس نظام سے سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، اکتناز، احتکار، اجارہ داری اور ان تمام صورتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جن کی بدولت دولت قوم کے چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو جاتی ہے۔ اس لئے مفاد پرستوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حامیوں نے ان کے بارے میں یہ غلط بیانی کی بلکہ دروغ گوئی شروع کی کہ مولانا "اندر سے" اشتراکی ہیں۔ جب یہ بات انہوں نے سنی، تو فرمایا کہ اگر میں اشتراکیت یا اشتمالیت کے معاشی نظام کو اسلام کے معاشی نظام سے بہتر سمجھتا تو مجھے کون سی چیز اشتراکی یا اشتمالی بن جانے سے روک سکتی تھی؟ جس طرح میں نے اسلام کی خاطر اپنے والدین سے قطع تعلق

کرلیا جو بہت دشوار ہے اسی طرح میں اشتراکیت کی خاطر اپنے دوستوں سے قطع تعلق کرلیتا جو نسبتاً بہت آسان تھا۔ مسلمان ہو کر مجھے وہ کون سا مالی یا دنیاوی فائدہ حاصل ہوا جو مجھے ترکِ اسلام سے روک سکتا تھا؟

حقیقت حال یہ ہے کہ ہم صدیوں سے غیر اسلامی طرز کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں اور اب اس طرزِ زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ ہمیں قرآن کی طرف بلاتا ہے تو ہم اسے بلا تامل "وہابی" یا "اشتراکی" کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام کا ذکر تو بڑی بات ہے۔ آج ہم کسی شخص سے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ فلاں رسم غیر اسلامی ہے۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی (اقبال)

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف: ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے۔ ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبا پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

• ضخامت ۲۳۶ صفحات • سائز بڑا • طباعت آفسٹ • مجلد مع گرد پوش

قیمت ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، کرشن نگر لاہور

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۱۰)

۲۱۔ آگے کا مضمون آیات ۱۴۱-۱۶۵

آگے ان بدعات کی تردید فرمائی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس تردید کے کئی پہلو ہیں۔

اوّل یہ کہ زمین کی پیداوار ہو یا مال مویشی، سب خدا ہی نے پیدا کئے ہیں اور اسی کی عنایت سے تمہیں ملے ہیں تو ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو، ان میں سے خدا کا حق ادا کرو اور شیطان کی پیروی میں اپنے جی سے، مشرکانہ توہمات کے تحت، حلال و حرام نہ ٹھہراؤ۔ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

دوسرا یہ کہ تمام چوپایوں میں سے نر و مادہ دونوں کو لے کر ایک ایک سے متعلق سوال کیا ہے کہ بتاؤ ان میں سے نر حرام ہے یا مادہ اور مطالبہ کیا ہے کہ کسی سند سے یہ ثابت کرو کہ ان چوپایوں میں سے کوئی ایک بھی ملتِ ابراہیمؑ میں حرام تھا۔ جب ان میں سے کسی کی حرمت تم کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے تو انہی کی نسل سے پیدا شدہ جانوروں میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کس طرح بن جائے گا؟ آخر ایک ہی درخت کے کچھ پھل جائز اور کچھ ناجائز ہونے کے کیا معنی؟

تیسرا یہ کہ ملتِ ابراہیمؑ کے حلال و حرام سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں تو فلاں فلاں چیزوں کے سوا اور کسی چیز کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔ یہود پر جو چیزیں حرام ہوئیں وہ بھی وہی ہیں جو ملتِ ابراہیمؑ میں حرام تھیں بجز ان چیزوں کے جو اُن کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر حرام کی گئیں۔

اس کے بعد ملتِ ابراہیمؑ کی بنیادی تعلیمات کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ اسی صراطِ مستقیم کی تمہیں دعوت دی جارہی ہے تو اس سے منحرف ہو کر گمراہی کی وادیوں میں نہ بھٹکو۔ اسی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو جو شریعت عطا ہوئی

اس کا حوالہ دیا کہ وہ بھی ان کے لیے جنہوں نے اس کو صحیح طریقہ پر قبول کیا، اسی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی تھی۔

اس کے بعد اس احسان عظیم کا ذکر فرمایا جو اس قرآن کو نازل کرکے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پر کیا اور یہ تنبیہ فرمائی کہ یہ کتاب اتار کر اللہ نے تم پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ اگر اس کو ماننے کے لیے عذاب کے منتظر ہو تو یاد رکھو کہ عذاب آجانے پر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ نافع نہیں ہوا کرتا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ خدا نے مجھے تو ملت ابراہیمؑ کی ہدایت بخش دی۔ میری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ تم میں سے جو یہ راہ اختیار کرنی چاہے، اختیار کرے ورنہ خدا کے حضور جواب دہی کے لیے تیار رہے۔ وہاں ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ کوئی دوسرا اس کے بوجھ کو اٹھانے والا نہ ہوگا۔ ساتھ ہی قریش کو تنبیہ فرمائی کہ تم پہلی قوم نہیں ہو جو دنیا میں پیدا ہوئی ہو۔ تم سے پہلے بھی قومیں آچکی ہیں اور اپنی سرکشیوں کے نتیجے میں کیفر کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر ان کے جانشین ہو کر تم نے بھی وہی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارے معاملے میں سنت الٰہی بدل جائے۔ تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے جس کو وہ پہنچیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے:

انعام ۶: ۱۴۱-۱۵۵

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ
حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۱۴۱ وَمِنَ الْاَنْعَامِ
حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۱۴۲ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ
مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا
اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّـُٔـوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۱۴۳
وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ
اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ
اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِھٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا
لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۴۴
قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ

يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا
اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۴۵ وَعَلَي الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ
الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ
اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۱۴۶
فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۱۴۷ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ
مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰي ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۱۴۸
قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۱۴۹ قُلْ
هَلُمَّ شُهَدَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ
شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۱۵۰ قُلْ تَعَالَوْا
اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ
وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۱۵۱ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ
اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰي يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا
نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰي ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ
اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۱۵۲ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ
مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ
وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۱۵۳ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَي الَّذِيْٓ
اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ۱۵۴ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ

تُرْحَمُونَ ۝۱۵۵ أَنْ تَقُولُوٓا إِنَّمَآ أُنزِلَ الْكِتَـٰبُ عَلَىٰ طَآئِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن
كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَـٰفِلِينَ ۝۱۵۶ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّآ أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَـٰبُ لَكُنَّآ
أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِـَٔايَـٰتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ
عَنْ ءَايَـٰتِنَا سُوٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ۝۱۵۷ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن
تَأْتِيَهُمُ الْمَلَـٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ ءَايَـٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ
ءَايَـٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَـٰنُهَا لَمْ تَكُنْ ءَامَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ
فِىٓ إِيمَـٰنِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوٓا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۝۱۵۸ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ
وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِى شَىْءٍ ۚ إِنَّمَآ أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم
بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝۱۵۹ مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَآءَ
بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰٓ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۱۶۰ قُلْ إِنَّنِى هَدَىٰنِى
رَبِّىٓ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۶۱
قُلْ إِنَّ صَلَاتِى وَنُسُكِى وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِى لِلَّهِ رَبِّ الْعَـٰلَمِينَ ۝۱۶۲ لَا شَرِيكَ
لَهُۥ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝۱۶۳ قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِى رَبًّا
وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ
أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝۱۶۴
وَهُوَ الَّذِى جَعَلَكُمْ خَلَـٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَـٰتٍ
لِّيَبْلُوَكُمْ فِى مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۶۵

اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے، کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیداوار کی۔ اور زیتون اور انار باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے قد کے بھی۔ تو اللہ نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۱۴۱ - ۱۴۲

چوپایوں کی آٹھ قسموں کو لو، بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں میں سے نر و مادہ دو۔ پھر ان سے پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں کو یا اس بچے کو جو ان مادینوں کے رحم میں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح اونٹوں میں سے نر و مادہ دو اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو۔ پھر پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمہیں اس کی ہدایت فرمائی؟ تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۱۴۳ - ۱۴۴

کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۴۵

اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمہارا رب بڑی رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا۔ ۱۴۶ - ۱۴۷

جنہوں نے شرک کیا وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو تمہارے پاس ہے اس کی کوئی سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو؟ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو۔ اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو، اللہ کے لیے تو بس حجت ہے پہنچ جانے والی اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہو، لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شہادت دیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو

آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ ۱۴۸ - ۱۵۰

کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمہارے رب نے حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لئے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ، تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمہارا قرابت والا ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اسی کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ اس کے غضب سے بچو۔ ۱۵۱ - ۱۵۳

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اپنی نعمت پوری کرنے کے لئے اس پر جو خوب کار تھا اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ ۱۵۴

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی کہ ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے دوسروں کو پھیرے۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت برا عذاب دیں گے۔ وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا

جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہی ہیں۔ ۱۵۵ - ۱۵۸

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے تمہارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی ان کو جمع کرے گا پھر انہیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ جو نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اسی کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ ۱۵۹ - ۱۶۰

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے رستے کی طرف فرمائی، دین قیّم ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔ پوچھو، کیا اللہ کے سوا کسی اور کو رب بناؤں جبکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔ اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا۔ پس وہ تمہیں بتائے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ ۱۶۱ - ۱۶۵

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا ۚ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ ۱۴۱ - ۱۴۲

وھو الذی انشأ جنٰت معروشات۔ یعنی کھیتی اور باغ سب پیدا کئے ہوئے

تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیویوں، دیوتاؤں کو کس حق کی بنا پر شریک بنا ڈالا؟ 'معروشات' سے مراد انگور وغیرہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ 'غیر معروشات' سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ٹٹیوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ انگور کی بیلوں کی مناسبت سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ 'غیر معروشات' وہ بیلیں ہیں جو زمین ہی پر پھیلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ۔ سورہ عبس میں 'عنب' اور 'قضب' دو چیزوں کو جمع کیا ہے۔ 'عنب' انگور کو کہتے ہیں اور 'قضب' ان سبزیوں کے لیے معروف ہے جو تازہ حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں باغوں اور کھیتیوں کی گوناگونی و بوقلمونی، ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف و تعدد کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود بعض حقائق کی طرف توجہ دلانا ہے۔

ایک یہ کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسا پیٹ بھر لینے کا سامان پیدا کر دیا ہو بلکہ الوانِ نعمت کے انبار لگا دیئے۔ باغ اگائے تو گوناگوں قسم کے، کھجور اور غلے پیدا کئے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کئے تو مختلف انواع کے۔ آخر محض زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں؟ لیکن اس دنیا کے خالق نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم نے ابتداً ہو ہمارے لئے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے اس کے لئے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اس کا فطری اثر اس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اس کا شکر گزار بندہ بنے اور اس کا حق پہچانے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

دوسری یہ کہ پروردگاری اور ربوبیت کا یہ ساز و سامان، جس سے ہم بلا استحقاق فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہمارے اوپر ایک بہت بھاری ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جس نے یہ سب کچھ ہمارے لئے بنایا ہے ضرور ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ہم سے ایک ایک نعمت سے متعلق سوال کرے کہ جس کے خوانِ نعمت سے ہم نے یہ فائدے اٹھائے

اس کی وفاداری کا حق ادا کیا یا نہیں اور پھر اسی کے لحاظ سے وہ ہم کو جزا یا سزا دے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ہر حق اور ہر تمتع کے ساتھ ذمہ داری اور ہر (Privilege) کے ساتھ (Responsibility) لازمی ہے۔ ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا انسانی فطرت کے بدیہیات میں سے ہے۔ ہر حساس انسان اس کو تسلیم کرتا ہے۔ صرف لئیم، کمینہ اور بلید لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھائیں لیکن ان کے جواب میں کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔

تیسری یہ کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گوناگونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ مٹی، پانی، ہوا ایک ہی لیکن اشیا گوناگوں قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لئے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا اسی نے انگور اور انار کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کئے اسی نے ان اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کئے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن و جمال کا ذوق بخشا اسی نے ہر چیز کو حسن و رعنائی، دلکشی و دلربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیاء کے ظاہری تضاد و اختلاف کے اندر اسی وحدت مقصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اس کائنات کے خالق اور اس کے متصرف کی توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ آیات ۹۹ - ۱۰۱ کے تحت بھی بعض اشارے گزر چکے ہیں۔ مزید تفصیل کے طالب ہماری کتابیں 'حقیقتِ شرک' اور 'حقیقتِ توحید' پڑھیں۔ ان میں ہم نے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

'کلوا من ثمرہ اذا اثمر واتوا حقہ یوم حصادہ' یہ تعلیم تمام نعمتیں اپنی زبان حال سے بھی دے رہی ہیں اور یہی تعلیم خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں نے بھی دی ہے اور یہی ان نعمتوں کا وہ حق بھی ہے جس کی شہادت خود ہماری فطرت دیتی ہے بشرطیکہ وہ مسخ نہ ہو گئی ہو۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان کھیتیوں اور ان باغوں سے خود فائدہ اٹھاؤ اور جب فصلوں کے کاٹنے اور پھلوں کے توڑنے کا وقت آئے تو ان کا حق ادا کرو۔ 'حقہ' میں ضمیر کا مرجع خدا بھی ہو سکتا ہے اور ثمر بھی لیکن دونوں صورتوں میں باعتبار مفہوم کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔ ہر نعمت جو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے اس کا ایک حق واجب یہ ہے کہ جس کو یہ نعمت ملے وہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرے جو اس سے محروم ہیں۔ یہ اس نعمت کی شکر گزاری کا حق ہے۔ یہی حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا حق کہا جاتا ہے۔ اس حق کا شعور انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ جب سے انسان پایا جاتا ہے، تمام بھلے انسانوں کے اندر اس حق کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ کا

بیٹا ہابیل اپنی بھیڑوں بکریوں کا جو نذرانہ خداوند کے لیے لایا تھا وہ اسی حق کی ادائیگی کے لئے لایا تھا۔ یہی حق ہے جس کی ادائیگی کے لیے اسرائیلی شریعت میں بھی اور پھر اسلام میں بھی زکوٰۃ کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا۔

زکوٰۃ کا تعلق پیداوار سے

'یوم حصادہ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس حق کی ادائیگی فصل کے دروکے وقت اس کے حاصل سے ہونی چاہیئے۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہ حق درحقیقت اس نعمت الٰہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو حاصل ہوئی۔ اس وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ کا حق پیداوار پر رکھا ہے۔ یہی بات عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اس زمانے میں دوسری قوموں کی نقالی میں مسلمانوں نے بھی ایک بالکل غیر اسلامی مالیاتی نظام اختیار کر لیا ہے اس وجہ سے مسلمان حکومتیں زکوٰۃ کے بجائے ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ یہ چیز اس برکت اور اس عدل سے بالکل خالی ہے جو اسلام کے نظام زکوٰۃ میں ہے۔

'من ثمرہ اذا اثمر' میں ضمیر ہرچند واحد ہے لیکن مراد وہ ساری ہی چیزیں ہیں جو مذکور ہوئیں۔ اس طرح متعدد چیزیں ذکر کرنے کے بعد جب ضمیر یا فعل واحد لاتے ہیں تو مقصود ان میں سے ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ہر پیداوار پر خدا کا حق ہے، خواہ کوئی شے بھی ہو، اس سے استثنا کسی شے کا نہیں بلکہ ایک خاص مقدار کا ہے۔ شریعت نے ایک خاص حد تک کی پیداوار پیدا کرنے والے کی ضروریات کا لحاظ کر کے اس حق سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مقدار کیا ہے تو اس کا تعلق فقہ سے ہے اور یہ تفصیل طلب ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔[1]

'اذا اثمر' کا تعلق صرف 'کلوا' سے نہیں ہے بلکہ 'کلوا' اور 'اتوا حقہ' دونوں سے ہے۔ یعنی جس طرح پیداوار سے انتفاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر اسی طرح اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس سے یہ حقیقت مزید موکد ہو گئی کہ اس حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلام کا نظام زکوٰۃ ہے۔

'ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین'۔ یہ ادائے حق کے ساتھ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں بعینہٖ اسی سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے۔ 'وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی

[1] فقہا بعض اموال کو اموالِ زکوٰۃ میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ شے نہایت محدود مقدار میں محض گھریلو استعمال کے حد تک پیدا کی جاتی ہو تب تو بے شک وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر انہی چیزوں میں سے کوئی چیز کوئی زمیندار بڑے پیمانہ پر کاشت کرے یا وہی چیز کسی علاقہ یا ملک کی عام پیداوار کی حیثیت رکھتی ہو یا حاصل کرلے تو آخر وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کیوں رہے گی؟

حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ٥ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۲۶-۲۷ بنی اسرائیل (اور قرابت مند، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے بھی کہ حقوق کی ادائیگی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی اپنی ضروریات و خواہشات کے معاملے میں معتدل، کفایت شعار اور میانہ رو ہو۔ جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو اس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ دوسرے کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اسی راہ سے کرتا ہے۔ وہ ان کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ ان خواہشات و تعیشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں ان کے یہ للّے تللّے ہیں اس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کتّے، باز، شکرے تو آسودہ رہتے ہیں لیکن ان کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔

حمولۃ اور فرش کی تحقیق

'ومن الانعام حمولۃ وفرشا'۔ 'حمولۃ'، 'رکوبۃ' اور 'حلوبۃ' کے وزن پر ہے اور اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری اور بار برداری کے لیے موزوں ہیں مثلاً اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ۔ الابل التی تحمل وکل ما احتمل علیہ القوم من بعیر وحمار ونحوہ۔

'الفرش' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو، اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی اپنے ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو اور حیوانات کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس سے مراد وہ چھوٹے جانور ہوتے ہیں جو سواری یا بار برداری کے لئے موزوں نہیں ہیں، صرف ذبح یا دوسری ضروریات ہی کے لئے موزوں ہیں، مثلاً بکریاں، بھیڑیں وغیرہ۔ قرینہ دلیل ہو تو اس میں چھوٹے اونٹ اور گائے بیل بھی شامل ہو جاتے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ 'حمولۃ' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے لازماً یہاں چھوٹے چوپائے ہی مراد ہوں گے۔

اوپر والی آیت میں 'جنات معروشات و غیر معروشات' کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ اس کے مقابل میں چوپایوں کا ذکر فرمایا تو ان کو بھی دو بڑی قسموں — 'حمولۃ' اور 'فرش' میں تقسیم فرما دیا۔ زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں نہایت حسین قسم کا تقابل ہے۔ 'حمولۃ'، 'معروشات' کا مقابل ہے۔ 'فرش'، 'غیر معروشات' کا۔ گویا جس طرح نباتاتی کھیتیوں اور باغوں میں قدرت نے ایسی بیلیں بھی پیدا کی ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور ایسی بھی جو زمین ہی پر پھیلتی ہیں، اسی طرح چوپایوں میں 'حمولۃ' بھی ہیں جن کو قدرت نے اونچے ڈھانچوں پر کھڑا کیا ہے اور 'فرش' بھی ہیں جو زمین سے لگے ہی

ہوئے چرتے چگتے پروان چڑھتے ہیں اور انسان کو اپنے گوشت، کھال، اُون، دودھ ہر چیز سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اس لفظی تجانس کے ساتھ ساتھ اس معنوی تجانس پر بھی نگاہ رکھیے جو دونوں آیتوں میں یکساں موجود ہے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان کا ایک خاص پہلو ان کی گوناگونی و بوقلمونی بھی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، عنایت اور حکمت کی شہادت ملتی ہے اور یہ شہادت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید اور جزا و سزا کی نہایت اہم آفاقی و نفسی دلیل ہے۔ اسی دلیل کی طرف یہاں بھی چوپایوں کے تنوع کا حوالہ دے کر اشارہ فرما دیا ہے اور یہ اشارہ فکر انسانی کے لیے ایک مہمیز ہے، بشرطیکہ انسان غور کرنا چاہے۔

شیطان کے دو خاص حربے

'کلوا مما رزقکم اللّٰہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین'

جس طرح اوپر والی آیت میں نعمتوں کے ذکر کے بعد ان کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'کلوا من ثمرہ اذا اثمر الآیہ'، اسی طرح ان چوپایوں کی نعمت کا حق یہ بیان فرمایا کہ کلوا مما رزقکم اللّٰہ، کہ اللہ نے یہ نعمتیں جو تمہیں بخشی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمہارے لیے نافع ہیں ان کو برتو، اپنے مُنعم کا شکر ادا کرو اور ان کے اندر جو خدا کا حق ہے وہ ادا کرو۔ یہ باتیں چونکہ سیاق کلام سے ظاہر ہیں، نیز اوپر ان کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی البتہ شیطان کے فتنوں سے آگاہ فرما دیا کہ اس کے نقش قدم کی پیروی نہ کیجیو اس لئے کہ وہ کھلم کھلا پہلے ہی الٹی میٹم دے چکا ہے کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈالے گا تو تم اس کے کہے پر اپنے جی سے حرام و حلال ٹھہراؤ گے اور خدا کے بخشے ہوئے چوپایوں کو جن کے نام پر نیاز اور قربانی کے طور پر پیش کرو گے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ ۱۱۹ - نساء (اور شیطان نے کہا میں تیرے بندوں میں سے ایک متعین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، اور میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو آرزوؤں کے سبز باغ دکھاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے) اوپر والی نعمتوں کے سلسلے میں شیطان کی ہیزتی اسراف و تبذیر کے پہلو سے بیان ہوئی۔ یہاں اس کی مشرکانہ وسوسہ اندازیوں کا ذکر ہوا۔ اور شیطان کے یہ دونوں ہی حربے اولادِ آدم پر بڑے کارگر ثابت ہوئے ہیں۔

اس آیت میں 'اکل' یا 'رزق' کے الفاظ ان محدود معنوں میں نہیں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں عام طور پر ہم لیتے ہیں۔ 'اکل' برتنے اور فائدہ اٹھانے کے مفہوم میں ہے اور 'رزق' ایک جامع تعبیر ہے بخشش الٰہی کی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ

قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۴۳ - ۱۴۴

'ثمانیۃ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ عام طور پر لوگوں نے فعل ماضی محذوف مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک قرینہ یہاں فعل امر کے محذوف ماننے کا ہے۔ جملہ کی وضاحت سے اس قرینے کی وضاحت ہو جائے گی۔

'زوج' کا لفظ جس طرح جوڑے کے لئے آتا ہے اسی طرح جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی ادب اور قرآن دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

لفظ 'انعام' کا اطلاق کن چوپایوں پر ہوتا ہے؟

پالتو چوپایوں میں سے جو گوشت یا دودھ وغیرہ کے لیے عرب میں پائے جاتے تھے چار معروف تھے۔ چھوٹے چوپایوں میں بھیڑ بکری، بڑے چوپایوں میں اونٹ گائے[1] 'انعام' کا لفظ انہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ جب اس کی طرف لفظ 'بہیمۃ' کی نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں جیسا کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، وہ وحشی چوپائے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اگرچہ پالتو نہیں ہیں لیکن شامل انعام ہی کی جنس میں ہیں مثلاً ہرن، جنگلی بکرے، پاڑھے، نیل گاؤ، گورخر وغیرہ۔

چونکہ یہاں زیر بحث پالتو چوپایوں ہی کی حلت و حرمت ہے اس لئے کہ اہل عرب نے انہی کے اندر سے، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض کو حلال، بعض کو حرام ٹھہرا رکھا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر ان سے پوچھو کہ ان میں سے کس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے اور ان سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے سوال کا جواب کسی علمی یا عقلی دلیل سے دیں محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلائیں۔

یہ معروف چوپائے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چار تھے۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ ان کے جوڑے

[1] بھینس چونکہ گرم اور مرطوب ملکوں کا چوپایہ ہے اس وجہ سے یہ عرب میں نہ معروف تھا نہ ہے۔

کے افراد نر اور مادہ دونوں کو الگ الگ گنیئے تو یہ سب آٹھ ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ ان آٹھوں کو لو اور ان میں سے ہر ایک کے نر و مادہ کو لے کر ان لال بھجکڑوں سے پوچھو کر بتائیں، ان میں سے نر کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے، یا مادہ کو یا مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو؟ مطلب یہ ہے کہ جب اصلاً یہ جانور، ان کے نر و مادہ دونوں، پیٹ کے بچہ سمیت، حلال ہیں، ان میں سے کسی کی حرمت کا دعویٰ یہ نہیں کر سکتے تو پھر انہی کے بعض اجزا پر یہ حرمت کہاں سے طاری ہو جاتی ہے کہ بعض کا کھانا ناجائز ہو جاتا ہے، بعض پر سواری حرام ہو جاتی ہے، بعض کو صرف مرد ہی کھا سکتے ہیں، اور بعض کو مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے بعد دونوں کھا سکتے ہیں۔ عقل و فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر درخت مباح ہے تو اس کا پھل بھی مباح ہو۔ یہ کیسی بات ہے کہ درخت تو مباح ہے لیکن اس کی ایک شاخ کا پھل حرام ہے۔ یا مردوں کے لیے تو یہ حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے۔ یا اتنے پھل دینے تک تو وہ حلال ہے لیکن اتنے پھل دے چکنے کے بعد اس پر حرمت طاری ہو جاتی ہے۔

مشرکین کے پاس نہ عقلی دلیل تھی نہ نقلی

'نبئونی بعلم ان کنتم صادقین' مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ان میں سے بعض چیزیں دین ابراہیمؑ میں حرام تھیں تو اس پر کوئی علمی دلیل پیش کرو۔ علمی دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دین ابراہیمؑ کی کوئی قابل اعتماد سند ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ فلاں فلاں چیزیں دین ابراہیمیؑ میں حرام تھیں یا کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ ہو جس سے ان کے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مجرد وہم پر اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر دینے کے کیا معنی؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اپنے جن مشرکانہ توہمات و رسوم کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے حق میں دلیل وہ صرف یہ پیش کرتے تھے کہ لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباؤنا ولا حرمنا من شئ ۱۴۸ (اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کر سکتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) ظاہر ہے کہ یہ کوئی دلیل عقلی ہے، نہ نقلی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو ہر احمق اپنی ہر حماقت کو اسی دلیل سے ثواب ثابت کر سکتا ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اختیار کر لینا بھی اس کی صحت یا حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس کی نسبت کی کوئی دلیل نہیں۔ آخر کس طرح باور کر لیا جائے کہ ان کے باپ دادا نے جو رسوم اختیار کیے کسی سند کی بنا پر اختیار کیے جبکہ خود اہل عرب کی روایات شاہد ہیں کہ جس طرح دین مسیحی کو پال نے بگاڑا، اسی طرح عربوں میں شرک و بت پرستی کا رواج ایک شخص عمرو بن لحی نامی کے ذریعے سے ہوا۔ قرآن نے عربوں کے ان توہمات کی تردید کے لیے عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل دیئے۔ ایک طرف تو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا وہ سارا تحریری ریکارڈ پیش کیا جو تورات کے صحیفوں میں موجود تھا، جس کا ایک ایک حرف شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نہ صرف یہ کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل سے شرک کے ایک ایک جرثومہ کا قلع قمع کیا ہے۔ دوسری طرف

توحید خالص کے حق میں وہ عقلی و فطری دلیلیں دیں جو ناقابل تردید بھی ہیں اور جو حضرت ابراہیمؑ ہی کی، جیسا کہ اسی سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہے، پیش کردہ ہیں۔ غور کیجیے کہ کہاں قرآن کے یہ سورج کی طرح روشن دلائل اور کہاں اہل عرب کی یہ بات کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے باپ دادا کو پایا اس وجہ سے یہی اللہ کی شریعت اور یہی ابراہیمؑ کی ملت ہے۔

اتمام حجت کا آخری قدم

'ام کنتم شھداء اذ وصاکم اللہ بھذا' یہ اتمام حجت کا آخری قدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقل و نقل کا تعلق ہے ان میں سے تو کوئی چیز تمہارے ساتھ ہے نہیں پھر آخر کس بنیاد پر تم اللہ پر یہ بہتان باندھ رہے ہو کہ خدا نے فلاں فلاں چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جب اللہ نے ان چیزوں کی ہدایت فرمائی، تم اس وقت موجود تھے؟ پھر بتاؤ کہ ان سے بڑھ کر محروم النعمت، بدبخت اور ظالم کون ہو سکتا ہے جو بغیر کسی سند علمی و دلیل عقلی کے محض جھوٹے بہتان کو لوگوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ بنائیں!

'ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین' 'ظالمین' سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی طرف اوپر 'فمن اظلم' میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے ظالم ہیں کہ محض من گھڑت بہتان کو نہ صرف اپنی گمراہی کا بہانہ بنائے بیٹھے ہیں بلکہ اس کو دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بنا رہے ہیں اللہ ایسے لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ 'راہ یاب نہیں کرے گا' میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے۔ (واضح رہے کہ یہاں جو لوگ زیر بحث ہیں یہ قریش کے وہ سادات ہیں جو ان کی مذہبی پیشوائی کر رہے تھے) دوسرا یہ کہ خلق خدا کو گمراہ کرنے کی جو مہم یہ چلا رہے ہیں یہ محض بے بنیاد افترا اور جھوٹ پر مبنی ہے اس وجہ سے یہ منہ کی کھائیں گے، اس میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہو گی۔ یہ گویا نہایت لطیف انداز میں بشارت ہے دعوت اسلامی کی کامیابی کی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ
اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ
رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ
وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ
ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَایَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ
بِبَغْیِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ
وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ ۱۴۵-۱۴۷

'قُل لا اجِدُ فی ما اُوحی الیَّ الاٰیۃ'۔ اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں، انعام میں سے کیا چیزیں حرام تھیں۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہے کہ یہاں مشرکینِ عرب کے ساتھ جو بحث چل رہی ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ ہی سے متعلق ہے اور یہ بحث بھی خاص کر چوپایوں سے متعلق ہے اس لئے کہ انہی میں سے بعض کو انہوں نے، جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ موقع و محل کی یہ خصوصیت مقتضی ہے کہ اس اعلان کو اس کے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھا جائے۔ جن لوگوں نے اس کے مخصوص موقع و محل سے ہٹا کر اس کو اسلام کے عام ضابطۂ حلت و حرمت کی حیثیت دے دی ہے وہ اپنی اس غلط فہمی کے سبب سے خود بھی الجھن میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھن میں ڈالنے کا سبب بنے ہیں، اس لئے کہ اسلام میں صرف یہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ چیزیں بھی حرام ہیں مثلاً درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ اور اسلام ہی میں نہیں بلکہ خود ملتِ ابراہیمؑ میں بھی ان کے علاوہ چیزیں حرام تھیں لیکن یہاں چونکہ زیرِ بحث مسئلہ، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، انعام ہی کا تھا اس وجہ سے ان کے باب میں یہ وضاحت فرما دی کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ محض من گھڑت ہیں، ملتِ ابراہیمؑ میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

'علی طاعمٍ یطعمہ'؛ (کسی کھانے والے پر جو اس کو کھائے) کے اسلوب میں جو تعمیم ہے اس سے مشرکین کے ان توہمات کی تردید ہو رہی ہے جو بعض مخصوص قربانیوں اور جانوروں سے متعلق وہ رکھتے تھے کہ ان کو خاص خاص لوگ ہی کھا سکتے تھے، ہر شخص ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ بعض جانوروں کے گوشت مرد ہی کھا سکتے تھے، عورتوں کے لیے ان کا کھانا حرام تھا (ملاحظہ ہوں آیات ۱۳۸-۱۳۹) قرآن کے ان الفاظ نے یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح ان کی یہ مشرکانہ قربانیاں بے اصل و بے سند ہیں اسی طرح ان کے کھانے کے باب میں ان کی یہ تفریق و تقسیم بھی محض ان کے واہمہ کی خلاقی ہے، ملتِ ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ممنوع جو چیز ہے وہ ان کا کھانا ہے، ان سے انتفاع کی دوسری صورتیں ممنوع نہیں ہیں۔

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت، اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان میں سے سابق الذکر تین چیزوں کی حرمت ان کی ظاہری نجاست کی بنا پر ہے۔ ان کے ذکر کے بعد فرمایا ہے۔ 'فانہٗ رجسٌ' ہمارے نزدیک اس کا تعلق مذکورہ تینوں ہی چیزوں سے ہے۔ ضمیر جب اس طرح واحد آتی ہے تو بعض اوقات، جیسا کہ ہم آیت ۱۴۵ کے تحت ذکر کر چکے ہیں،

وہ سابق الذکر ساری ہی چیزوں پر حاوی ہو جاتی ہے، گویا وہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے۔ آخری چیز کی حرمت باطنی نجاست کی بنا پر ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک اعتقادی نجاست ہے اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس اعتقادی نجاست کو یہاں 'فسق' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیمؑ میں اشیاء کی حلت و حرمت محض تحکمی نہیں بلکہ فطری و عقلی بھی ہے۔ مذکورہ حرمتوں پر بھی اور اس کے ساتھ ضرورت و اضطرار میں جو استثنا ہے اس پر بھی ایک سے زیادہ مقامات میں ہم بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہاں حلت و حرمت سے متعلق یہ بنیادی اصول ذہن میں رہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں تمام طیبات حلال تھیں، حرام صرف خبائث تھیں، عام اس سے کہ یہ خباثت ظاہری ہو یا باطنی۔ یہی بنیادی اصول اسلام میں بھی ملحوظ ہے اس لئے کہ اسلام جیسا کہ پچھلی سورتوں میں واضح ہو چکا ہے، یہودیت و نصرانیت کے برعکس ملت ابراہیمؑ پر مبنی ہے۔ آگے ہم اسلام کے اصول حلت و حرمت کی وضاحت کریں گے۔

'وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر الاٰیۃ'۔ ملتِ ابراہیمؑ کے بعد اب یہ ملت یہود کا ذکر فرمایا کہ ان کے اوپر بے شک بعض طیبات حرام کر دی گئی تھیں مثلاً تمام ناخون والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی لیکن یہ حرام کرنا اس لئے نہیں تھا کہ فی نفسہٖ یہ چیزیں قابلِ حرمت تھیں بلکہ یہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کی گئی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ملت اسلام میں یہ حرمتیں باقی نہیں رہیں بلکہ تمام طیب چیزیں اس میں مباح کر دی گئیں، اور یہود پر جو قیدیں اور پابندیاں (اصر و اغلال) عائد کی گئی تھیں وہ، جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا، خاتم الانبیاءؐ کی بعثت کے بعد اٹھا لی گئیں۔

یہود پر 'ہر ناخون والے جانور' اور چربی کی حرمت کا یہاں جو ذکر ہے اس کی وضاحت کے لئے ہم تورات کے بعض حوالے پیش کرتے ہیں۔ پہلے چربی کی حرمت کے مسئلہ کو لیجئے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہو تم نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے جسے لوگ آتشی قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے"

دوسرے مقام میں چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی ہے جو ان کے لئے حرام ٹھہرائی گئیں۔

"جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سبھوں

کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشین قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے۔ ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمہاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔ احبار باب ۳۔ ۱۵-۱۷

قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جزو کی حیثیت رکھتی ہو، مگر یا آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو بآسانی الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ یہی بات عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چربی مطلق حرام تھی۔ ہمارے نزدیک یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا۔ چربی تو درکنار خون بھی آخر کچھ نہ کچھ تو گوشت کے جزو کی حیثیت سے رہ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اوپر خون کی جو حرمت بیان ہوئی ہے، اس کے ساتھ 'مسفوح' کی قید لگی ہوئی ہے تاکہ پابندی اسی حد تک رہے جس حد تک دائرہ فطرت کے اندر ہے، اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

'کل ذی ظفر' سے کیا مراد ہے؟ 'ظفر' یوں تو ناخن کو کہتے ہیں۔ لسان میں ہے۔ 'الظفر یکون للانسان' ظفر انسان کے ناخن کو کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ 'الظفر لما لا یصید والمخلب لما یصید' جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخن کو ظفر کہتے ہیں، جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجہ کو 'مخلب' کہتے ہیں۔

تورات کے مطالعہ سے حرام و حلال کی جو تفصیل سامنے آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہیں۔ جن کے اندر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ ان کے ہاں حرام ہے۔ چنانچہ اونٹ، سافان اور خرگوش اور وہ تمام جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں یہود کے ہاں حرام ہیں۔ اس روشنی میں 'ذی ظفر' کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور، جیسا کہ 'کل' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیم میں جائز تھے مثلاً اونٹ، بطخ، قاز وغیرہ

ذٰلک جزینٰھم ببغیھم و انا لصٰدقون۔ یعنی ناخن والے جانوروں اور چربی کی علی الاطلاق حرمت بنی اسرائیل پر اس وجہ سے نہیں تھی کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود ہے بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فساد مزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے، سزا کے طور پر، بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام

ٹھہرا دیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن نے 'بغی' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیاء کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کو انہوں نے بخوشی قبول کیا ہو۔ جو حکم بھی ان کو دیا گیا اوّل تو انہوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا لیا جس کی ایک مثال سورۂ بقرہ میں گائے کے قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اس کو مانا بھی تو اس سے گریز اور فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم ان کے لئے بالکل بے اثر ہو کے رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت سخت قوانین میں باندھا جن کو قرآن میں 'اصر' و 'اغلال' یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے تو آدمی کا رواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملت اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں۔ یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قازیں، بط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

ان چیزوں کے حرام کئے جانے کی علت، جیسا کہ واضح ہوا، یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ سورہ مائدہ میں بیان ہو چکا ہے، یہود کو یہ احکام دیتے وقت ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اگر تم ان پر ایمان لائے تو وہ یہ پابندیاں تم پر سے اٹھا دیں گے اس لئے کہ ان کی بعثت دین فطرت، ملت ابراہیم پر ہوگی جس میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہوگی۔

'وانا لصٰدقون' کے الفاظ یہاں بہت بلیغ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو اتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیم اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ہم اس میں بالکل سچے ہیں اور جو نزاع خالی یہ قریش اور یہود کے مفسدین واشرار کر رہے ہیں یہ بالکل جھوٹے ہیں

'فان کذبوک فقل ربکم ذو رحمۃ واسعۃ' : اب یہ قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبرؐ کو خطاب کرکے فرمایا کہ اس ساری وضاحت کے بعد بھی اگر یہ تم پر ایمان نہ لائیں، بدستور تمہارے جھٹلانے ہی پر اڑے رہیں تو ان کو سنا دو کہ اللہ چونکہ بڑی وسیع رحمت والا ہے، وہ سرکشوں اور ہٹ دھرموں کو بڑی دور اور بڑی دیر تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اس وجہ سے وہ تمہیں ڈھیل پر ڈھیل دے رہا ہے۔ اس ڈھیل سے مغرور نہ ہو جاؤ۔ ڈھیل بہرحال ڈھیل ہے۔ اس سے اللہ کی پکڑ پیچھے تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن اس سے اس کی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی جو مجرموں کی پکڑ کے لئے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ جب اس کی اس سنت کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکے گی۔

اوپر ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل کی جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں، اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مشرکین نے بلاسند بہت سی چیزیں جو حرام ٹھہرا رکھی تھیں ان کی حرمت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح یہود بہت سی چیزوں کی حرمت کے جو مدعی تھے تو ان کی حرمت اصلاً نہیں بلکہ ان کے فساد مزاج کے سبب سے مصلحۃً تھی اور وعدہ الٰہی کے مطابق ان پابندیوں کو آخری بعثت کے ذریعے سے دور ہونا تھا، چنانچہ وہ، جیسا کہ سورہ مائدہ میں بیان ہوا، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور کر دی گئیں۔ اب اس ملت میں حرام وہی چیزیں ہیں جو عقل و فطرت کی رو سے حرام ہونی چاہئیں، مشرکین کی بدعات اور یہود کے تشددات سے اس ملت کا ضابطۂ حلت و حرمت پاک ہے۔

ہم اختصار کے ساتھ اسلام کا وہ ضابطۂ حلت و حرمت بھی پیش کئے دیتے ہیں جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔　(اسلام کا ضابطۂ حلت و حرمت)

قرآن نے حلت و حرمت کی فطری بنیاد یہ بتائی ہے کہ جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں، جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعریف بیان ہوئی ہے۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط ۱۵۷ - اعراف

وہ ان کو حکم دیتا ہے معروف کا اور روکتا ہے منکر سے اور ان کے لئے جائز کرتا ہے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور وہ پابندیاں جو ان پر اب تک تھیں۔

'طیبات' سے مراد، ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے اوپر اپنے اثرات کے اعتبار سے پاکیزہ، معتدل، صحت بخش اور نافع ہیں۔

'خبیثات' سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی جبلت اور انسان کے مزاج وطبیعت پر اپنے اثرات کے لحاظ سے مضر، نحوات انگیز اور مفسد ہیں۔

ان دونوں چیزوں کے اندر مذکورہ صفات کے اعتبار سے تفاوت درجات اور فرق مراتب ہوتا ہے۔ کوئی چیز زیادہ طیب ہوتی ہے، کوئی چیز کم، اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرق مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت کے درجے ہی میں رہتی ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث بن جاتی ہے۔ مثلاً غیر اللہ یا کسی مقام اور استھان کا ذبیحہ، جوئے کے ذریعہ سے حاصل کیا ہوا گوشت یا حالت احرام میں کیا ہوا شکار۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اشیا کے درمیان خبیث و طیب کا فرق محض ایک امر اضافی ہے، اس کی کوئی فطری یا عقلی و اخلاقی بنیاد نہیں ہے، ایک ہی چیز ایک قوم کے نزدیک حلال و طیب ہوتی ہے، وہی چیز دوسری قوم کے نزدیک خبیث و حرام قرار پاتی ہے۔ ایسا سمجھنا صریح سوفسطائیت ہے۔ یہ کہنا درحقیقت دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ حق و باطل، عدل و ظلم اور خیر و شر بھی محض اضافی امور ہیں، ان کی کوئی عقلی و فطری بنیاد نہیں ہے۔ اس مغالطے پر ان شاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

اسی طیب و خبیث کو معیار بنا کر اسلام نے چوپایوں میں سے وہ تمام چوپائے حلال ٹھہرائے جو انعام میں سے ہیں یا وحشی جانوروں میں سے انعام کے حکم میں داخل ہیں۔ مائدہ کے شروع میں 'احلت لکم بهيمة الانعام' کے الفاظ آئے ہیں اور وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'انعام' کا لفظ اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری کے لئے معروف تھا۔ اس کی طرف 'بہیمہ' کی اضافت نے اس میں وسعت پیدا کر دی اور وہ سارے جانور بھی اس میں شامل ہو گئے جو انعام کی جنس سے تعلق رکھنے والے ہیں عام اس سے کہ وہ پالتو ہیں یا وحشی، مثلاً بھینس، بچھڑے، دنبے، نیل گاؤ، ہرن، چیتل، پاڑھے وغیرہ۔ البتہ وہ جانور اس سے نکل جائیں گے جو درندوں کے حکم میں داخل ہیں۔ اس لئے کہ وہ بہیمہ الانعام کے تحت نہیں آتے مثلاً شیر، ریچھ، بھیڑیئے، کتے وغیرہ، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو حرام قرار دیا۔

اسی طرح مردار، خنزیر، بہایا ہوا خون اور غیر اللہ کے نام یا تھان اور استھان کا ذبیحہ بھی حرام ہے اس لئے کہ ان میں نجاست و خباثت ہے بعض کے اندر ظاہری نجاست ہے، بعض کے اندر عقلی۔

یہی ضابطہ پرندوں پر بھی لاگو ہوگا۔ ان میں سے بھی جو درندوں کی نوعیت کے ہیں، مثلاً چیل، باز، عقاب، شکرے وغیرہ یا ان کے اندر کوئی اس نوع کی خباثت پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئی وہ حرام ہیں باقی جائز۔

یہی ضابطہ دریائی جانوروں اور ہوام و حشرات پر بھی نافذ ہوگا۔ ان میں سے بھی خبیث و طیب کے اسی اصول کو سامنے رکھ کر فرق کیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا۔

اسی ضابطہ پر وہ چیزیں بھی پرکھی جائیں گی جو نباتات میں سے ہیں یا نباتات کی ترکیب و تحلیل سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً شراب خواہ کسی چیز سے تیار کی جائے حرام ہے اس لیے کہ اس میں عقلی و اخلاقی خباثت ہے۔

اسلام میں حلت و حرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی روشنی میں حلال بیّن اور حرام بیّن کا متعین کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن نہ دنیا میں چوپایوں کی کوئی حد ہے، نہ پرندوں کی، نہ دریائی جانوروں کی، اس وجہ سے بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہا نے مختلف چیزوں کے بارے میں اختلاف کیا بھی ہے یہ اختلاف فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے بعض لوگ بعض چیزوں کو درندوں میں داخل کرتے ہیں، بعض نہیں داخل کرتے۔ اسی طرح بعض چیزوں کو بعض فقہا خبیث قرار دیتے ہیں، بعض انکو خبیث نہیں قرار دیتے۔ ہمارے نزدیک اس باب میں حنفیہ کا مسلک قرآن کے بیان کردہ اصول حلت و حرمت سے زیادہ اوفق ہے لیکن اس طرح کے مسائل میں، جن کے اندر اختلاف کی گنجائش ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ان کو مشتبہات کے درجہ میں رکھے یعنی ان سے احتراز تو کرے، اگر اسکے نزدیک احتراز کا پہلو واضح ہے، لیکن دوسرے کو مرتکب حرام قرار نہ دے۔ حدیثوں میں گوہ کے باب میں حضورؐ کا جو ارشاد نقل ہے وہ اس طرح کے مسائل میں بہترین رہنمائی دیتا ہے۔

البتہ ایک تنبیہ یہاں ضروری ہے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ جو نقل ہوا ہے کہ وہ اسلام میں صرف وہی چار چیزیں حرام مانتے تھے جو اوپر "قل لا اجد فی ما اوحی الی" والی آیت میں مذکور ہیں، یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے نقل میں راویوں سے تسامح ہوا ہے۔ صحابہؓ میں سے کسی کی طرف اس بات کی نسبت بعید از عقل ہے۔ ان میں کسی نے اگر کہی ہوگی تو یہ بات کہی ہوگی کہ ملت ابراہیمؑ میں بس یہی چار چیزیں چوپایوں میں سے حرام تھیں۔ یہ بات کہنے کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی بات کو غلط فہمی کی بنا پر راویوں نے یہ شکل دے دی کہ وہ اسلام میں بس یہی چار چیزیں حرام مانتے تھے۔

اسلامی ریاست میں شہریت کے فرائض

(زیر طبع کتاب کا ایک باب)

مولانا امین احسن اصلاحی

ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا پایا جانا لازمی ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ جس درجہ کا حق ہے ذمہ داری بھی اسی درجہ کی ہو۔ یہ اصول انفرادی اخلاقیات میں بھی کارفرما ہے اور اجتماعی اخلاقیات میں بھی مسلم ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ آپ ایک حق سے تو فائدہ اٹھائیں لیکن اس کے ساتھ جو ذمہ داری لگی ہوتی ہے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیں یا یہ کہ جس درجہ کے حق سے آپ نے فائدہ اٹھایا ہے ذمہ داری اس درجہ کی اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوں، بلکہ اس سے ہلکے درجہ کی ذمہ داری پر معاملہ کرنا چاہیں یا سرے سے کوئی ذمہ داری اٹھانے ہی کے لئے تیار نہ ہوں۔ صرف حق ہی حق کے طلب گار ہوں یا اس سے بھی گذر کر ذمہ داری اٹھانا تو الگ رہا الٹے اس پر ایک مزید تاوان عاید کرنے کی کوشش کریں جس کی بدولت ایک حق سے آپ نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس طرح کے اخلاق رکھنے والے لوگ عائلی اور خاندانی دائرہ کے اندر لئیم، کمینہ اور ناشکرا قرار دیئے جاتے ہیں اور قومی و اجتماعی دائرہ کے اندر غدار اور دشمن ملت قرار پاتے ہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامی نظام کا معاملہ اس سے بدرجہا اہم ہے۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ خدا کی خوشی اور ناخوشی کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور دنیا کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ اہم چیز آخرت بھی زیر بحث آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کے حقوق سے متمتع ہوتا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا یا جس وفاداری کے ساتھ ان کو ادا کرنا چاہیئے ادا نہیں کرتا تو وہ صرف قوم اور ملک ہی کا غدار نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے رسول کا بھی غدار ہے اور صرف دنیا ہی میں سزا کا مستحق نہیں ہے بلکہ آخرت میں بھی سزا کا سزاوار ہے۔

پچھلے صفحات میں جن امور کی تفصیل کی گئی ہے ان پر ایک نظر پھر ڈالیے اور غور کیجئے کہ ایک اسلامی ریاست آپ کو کیسے عظیم الشان حقوق دیتی ہے! ــــــ وہ آپ کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے، وہ آپ کے املاک و جائداد کو قانونی حیثیت دیتی ہے اور ان کو ہر ناجائز دستبرد سے بچاتی ہے۔ وہ آپ کی شخصی آزادی

کی ضامن بنتی ہے تاکہ آپ کی شخصیت کے ارتقا میں کوئی خارجی مزاحم خلل انداز نہ ہو سکے اور آپ کی فطرت کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت ہیں وہ پوری طرح پروان چڑھ سکیں۔ وہ آپ کے فکر و نظر کی جولانی کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کرتی ہے اور اس میں نہ خود کوئی مداخلت کرتی ہے اور نہ دوسروں کو کوئی مداخلت کرنے دیتی ہے۔ وہ آپ کے لئے ایسے قانون کی حفاظت فراہم کرتی ہے جو شاہ و گدا اور امیر و غریب میں کسی طرح کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ وہ آپ کے لئے ایک ایسی سوسائٹی مہیا کرتی ہے جس میں نسل و نسب اور پیشہ و ذات کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ وہ آپ کو اسلامی بیت المال میں ریاست کے بڑے سے بڑے کارکن کے بالکل برابر حق دار قرار دیتی ہے۔ وہ آپ کو اس بات کی گارنٹی دیتی ہے کہ اگر آپ حاجت مند ہوں اور آپ کا کوئی کفیل نہ رہ گیا ہو تو وہ آپ کی ساری ضروریات کی کفیل ہو گی۔ وہ آپ کے لئے بے لاگ اور بالکل بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام کرتی ہے۔ وہ آپ کی اور آپ کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔ اگر آپ نے کوئی قرضہ چھوڑا ہے اور اس کی ادائیگی کا کوئی سامان نہیں چھوڑا ہے تو وہ آپ کا قرضہ بھی ادا کرتی ہے۔ وہ آپ سے اس بات کا عہد کرتی ہے کہ کبھی آپ کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ آپ پر نہیں ڈالے گی۔ آپ کو کوئی ایسا حکم نہیں دے گی جس کی تکمیل آپ کے لئے آپ کے خدا اور رسول کی نافرمانی کی موجب ہو۔ وہ آپ کو درخواست فریاد اور اعتراض اور نکتہ چینی کا بے روک ٹوک حق دیتی ہے۔ ان حقوق میں سے ایک حق بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کی ہستی کے تحفظ اور اس کی ترقی و کمال کے لئے انتہائی حد تک ضروری نہ ہو اور نہ ان میں سے کوئی حق ایسا ہے جس کو ریاست کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہوں۔ کنبہ، خاندان اور قبیلہ کے ذریعہ سے آدمی کو کچھ تحفظات و حقوق ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ بھی بیشتر حکومت کے فیض و کرم کا ثمرہ ہوتے ہیں اس وجہ سے لازمی ہے کہ جس طرح ریاست کے اوپر ہمارے حقوق ہیں اسی طرح ہمارے اوپر ریاست کے حقوق ہوں۔ اور بالکل اسی درجہ کے حقوق ہوں جس درجہ کے حقوق ہمارے ہیں اور جس طرح ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ ریاست سے اپنے حقوق کے لئے مطالبہ کریں اسی طرح ریاست کو بھی یہ حق حاصل ہو کہ وہ ہم سے اپنے حقوق کے لئے مطالبہ کر سکے۔

چنانچہ اب ہم ان ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں جو ان حقوق کے بدلہ میں اسلامی ریاست کے ہر شہری پر عائد ہوتی ہیں۔

سمع و طاعت

اسلامی ریاست کے ہر شہری پر سب سے بڑی ذمہ داری سمع و طاعت کی عائد ہوتی ہے۔ سمع کے معنی سننے اور ماننے کے ہیں اور طاعت کے معنی تعمیل کرنے اور بجا لانے کے۔ یعنی ریاست کے اولوالامر اور ارباب کار جو حکم دیں آدمی ان کو دل سے تسلیم بھی کرے اور ان کو بے چون و چرا

بجا لائے۔ عام طور پر ایک ریاست اپنے شہریوں سے صرف طاعت کے مطالبہ کا حق رکھتی ہے، سمع کا مطالبہ نہیں کرتی لیکن اسلامی ریاست دونوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کو اس زائد مطالبہ کا حق اس وجہ سے حاصل ہے کہ یہ زمین میں خدا کے احکام کے نفاذ و قیام کا ذریعہ ہے اسی بنا پر جیسا کہ علیحدہ ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کے بعد رسول کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کے ارباب کار کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے بعد لازمی قرار دیا ہے اور اس اطاعت کے لئے شرطیں بھی وہی ٹھہرائی ہیں جو رسول کی اطاعت کے لئے مقرر ہیں جن میں سب سے مقدم یہ ہے کہ یہ اطاعت دل کی تسلیم و انقیاد کے ساتھ ہو۔ اگرچہ ریاست کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ اس کے ظاہری رویہ کے مطابق ہی ہو گا کیونکہ اس کے پاس باطن کی تحقیقات کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں جس طرح ریا کارانہ نماز قبول نہیں ہوگی اسی طرح ایک اسلامی ریاست کے اولوالامر کی ریا کارانہ اطاعت بھی قبول نہیں ہوگی۔

یہ اطاعت تنگی و فراخی اور نرمی و سختی ہر حال میں واجب ہے۔ آدمی کا ذاتی مفاد خطرہ میں پڑ رہا ہو، اس کے کاروبار کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو، زندگی کی راحتیں اور لذتیں چھن جانے کا ڈر ہو، ان سارے حالات کے باوجود وسعت کی مشکل ... خدمت بھی تاحد امکان ہر شہری کے لئے انجام دینا ضروری ہے۔ مؤطا شریف میں عبادہ بن صامت ... سے روایت ہے کہ :-

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ	ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماننے اور تعمیل کرنے کا عہد لیا، تنگی و فراخی اور دشواری و آسانی ہر حال میں۔

جن حالات کے اندر اس اطاعت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے قانون کے اندر ان کی وضاحت موجود ہے۔ اگر ان شرعی عذرات کے بغیر کوئی شخص اولوالامر کی اطاعت میں کوتاہی کرے گا تو اس پر عند اللہ وہی ذمہ داری عائد ہوگی جو رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرنے والے پر عائد ہوئی اور اگر کسی شخص نے اسلامی نظام سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کی یہ موت اسلام پر نہیں ہوگی بلکہ جاہلیت پر ہوگی۔

اولوالامر کی اطاعت سے انکار کر دینے کی اجازت شریعت نے صرف دو صورتوں میں دی ہے۔ جزوی انکار کی اجازت تو اس صورت میں دی ہے جب ریاست بحیثیت خود تو اسلام کے اصولوں پر چل رہی ہو لیکن کارکنان حکومت اپنی دھاندلی سے کوئی حکم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف دے بیٹھیں۔ ایسی صورت میں ریاست کی وفاداری پر قائم رہتے ہوئے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ کارکنان حکومت کے اس خلاف شریعت حکم کی تعمیل سے انکار کر دے۔ خدا اور رسول کا حق حکومت کے حق سے بڑا ہے۔ اس وجہ سے حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ

ملہ اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک مستقل باب "اسلامی ریاست میں اطاعت کے شرائط اور حدود" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے (مدیر)

وہ خدا کے حق پر دست درازی کرے یا شہریوں کو مجبور کرے کہ وہ خدا کے کسی حق پر ہاتھ ڈالیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

السمع والطاعة حق ما لم یؤمر بالمعصیة فاذا امر بالمعصیة فلا سمع ولا طاعة (بخاری)	کارکنانِ حکومت کے احکام کو ماننا اور ان کی تعمیل واجب ہے جب تک وہ کسی ایسی بات کا حکم نہ دیں جس کی تعمیل میں اللہ کی نافرمانی ہو اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں تو پھر نہ تو اس کا ماننا جائز ہے اور نہ اس کی تعمیل کرنا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خود ریاست کی اساس و بنیاد ہی بالکل متغیر ہو جائے اور اس کو اسلام سے الحاد کر کفر کی بنیاد پر جما دیا جائے اور اقامت دین جو اسلامی ریاست کا اصل مقصد قیام ہے وہ فوت ہو جائے۔ ایسی صورت میں شریعت نے اولوالامر کی اطاعت سے شہریوں کو کلی انکار کا حق دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ریاست کی وفاداری کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر نظام حکومت کی تبدیلی کے لئے جس طرح کی جد و جہد کا امکان پائیں اس کو اختیار کریں[1]

خیر خواہی دوسرا سب سے بڑا فرض جو ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ ریاست اور کارکنانِ حکومت کی خیر خواہی کا ہے۔ یہ فرض بھی اللہ اور رسول کی خیر خواہی (اذا نصحوا للہ ورسولہ ..... الآیۃ) کا ایک ضروری جز ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کا بدخواہ ہے تو وہ اللہ اور رسول کا بدخواہ ہے۔ اس خیر خواہی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کوئی شہری دیدہ و دانستہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ریاست کے مفاد کے خلاف ہو۔ ریاست کی کسی چیز کو نہ خود نقصان پہنچائے نہ اپنے علم میں کسی کو نقصان پہنچانے دے۔ نہ کسی تخریبی کارروائی کا خود محرک بنے اور نہ تخریبی کارروائی کرنے والوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرے۔ اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو اس کو پوری دیانت و امانت اور پوری فرض شناسی و مستعدی کے ساتھ انجام دے۔ محض چھٹّا اتارنے اور صرف تنخواہ اور بھتہ وصول کرنے کی کوشش نہ کرے اور نہ رشوت، بے ایمانی، ناجائز اقربا پروری، اسراف اور ظلم و خیانت سے ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کرے۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی مفید تجویز، کوئی نافع سکیم اور کوئی قیمتی مشورہ ہو تو اس سے اربابِ کار کو ضرور آگاہ کرتا رہے۔ چاہے اس کی قدر کی جائے یا نہ قدر کی جائے اور اگر کسی امر میں اس سے مشورہ طلب کیا جائے تو پوری ایمان داری اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ صرف وہ مشورہ دے جو اس کے نزدیک حق ہے اور جس میں اللہ اور اس

[1] اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ ہم نے کتاب کے باب "اطاعت کے حدود" میں بحث کی ہے۔ اس وجہ سے یہاں صرف اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ (مؤلف)

کے رسول کی رضا ہے اگرچہ اس کے مشورہ کی وجہ سے اس کی ہردلعزیزی ختم ہو جائے اس کا ذاتی مفاد خطرہ میں پڑ جائے اور وہ کارکنانِ حکومت اور عوام دونوں کی نظروں میں نکوبن کر رہ جائے۔

اسی خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنے امکان بھر ریاست اور کارکنانِ ریاست کو اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کئے ہوئے راستہ سے منحرف نہ ہونے دے۔ اگر کوئی برائی ابھرتے دیکھے اور خود صاحب اقتدار ہو اور قانون اور حکومت کی قوت سے اس کو روک سکتا ہو تو طاقت کے ذریعہ سے اس کو روک دے اور اس فرض کی ادائیگی میں کسی مداہنت اور کمزوری کو راہ نہ پانے دے نہ کسی مصلحت اور مروت کو۔ اور اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو جہاں تک زبان و قلم کا تعلق ہے اس برائی کے خلاف ان کو حرکت میں لائے اور اس کو مٹانے کے لئے جی جان کی بازی لگا دے اور ہرگز کسی مصلحت یا مروّت کو خاطر میں نہ لائے اور اگر یہ ذرائع اس کے پاس نہ ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو برائی سمجھے اور اس سے نفرت کرے۔ یہ ایمان کا سب سے پست درجہ ہے جس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

اجتماعی خرابیاں جو کسی اسلامی ریاست کے اندر ابھرتی ہیں ان کے معاملہ میں کسی شخص کے لئے بے تعلقی اور بے پروائی (INDIFFERENCE) کا رویہ بالکل بے ایمانی اور اخلاقی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اجتماعی خرابیوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ ان کے مرتکبین اور ان کے خاموش تماشائی دونوں ان کے برے نتائج میں یکساں شریک ہوں گے[1]۔ بلکہ سورہ قلم میں باغ والوں کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی ان کے برے نتائج میں حصہ پاتے ہیں جو ان کے خلاف آواز تو اٹھاتے ہیں مگر بس مؤدبانہ تنقید کی حد تک۔ اس سے آگے بڑھ کر ان کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج کرنے اور ان کی برائیوں کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور علم کے باوجود اپنے اغراض کی خاطر بدستور اس مشین کے کل پرزے بنے رہتے ہیں جو ان ساری برائیوں کو وجود میں لاتی ہے۔ اسلامی شریعت ہر شہری سے اجتماعی برائیوں کے خلاف صرف رسمی سی مؤدبانہ تنقید ہی کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ پوری بیزاری اور اس سے علیحدگی اور برات کے اعلان کا مطالبہ کرتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی زندگی کی اصلاح کی ذمہ داریوں کو سمجھانے کے لئے ایک کشتی اور اس کے مسافروں کی تمثیل بیان فرمائی ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافروں کا فرض ہے کہ وہ جھپٹ کر ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے ورنہ کشتی ڈوبی تو سب کو لے کے ڈوبے گی۔ اسی طرح حیاتِ اجتماعی کے نظام میں اگر کچھ بگاڑنے والے بگاڑ پیدا کر رہے ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کے سوا کوئی اور طریقہ ایجاد کر رہے ہوں تو ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ جان

[1] سورہ انفال آیت ۲۵

کی بازی لگا کر ان مفسدین کو ان کے فساد سے روکے ورنہ اگر وہ اپنے فساد میں کامیاب ہو گئے تو جو فتنہ اس سے پھوٹے گا اس میں سب حصہ دار ہوں گے۔ اس صورت حال نے ہر شہری پر اس کی انفرادی زندگی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی ذمہ داری حیات اجتماعی کی دیکھ بھال کی بھی ڈال دی ہے اور چونکہ حیات اجتماعی کے صلاح و فساد پر سب کا بناؤ بگاڑ منحصر ہے اس وجہ سے اس راہ کی جان بازیوں کا جو اجر و ثواب ہے اس سے بڑا اجر و ثواب کسی عمل اور کسی خدمت کا بھی نہیں ہے۔ یہی خیر خواہی ہے جس کا حضرت عمرؓ نے لوگوں سے ان الفاظ میں مطالبہ فرمایا :-

واعینونی علیٰ نفسی بالامر بالمعروف	اور میرے نفس کی کوتاہیوں کے معاملہ میں امر بالمعروف
والنھی عن المنکر واحضار	اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے اور میری ذمہ داریوں
النصیحۃ فیما ولانی اللہ من امرکم	کے معاملہ میں حق خیر خواہی ادا کر کے میری مدد
(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل۔ صفحہ ۹۶)	کرتے رہو۔

اور یہی وہ فریضہ ہے جو اگر ایک حق سے انحراف اختیار کرنے والی حکومت کے مقابلہ میں ادا کیا جائے تو تمام جہادوں سے افضل جہاد ہے۔ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔

تعاون تیسرا فرض جو اسلامی ریاست کے ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ کارکنان حکومت کے ساتھ تعاون کا فرض ہے۔ خدا کی وفاداری اور اس کے قانون کی نگہداشت اور پاسداری کا حق ادا کرنے کے سلسلہ میں جو کام بھی کیا جائے اس میں تعاون کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے[1]۔ اور اسلامی ریاست اس مقصد کو بروئے کار لانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر اسلامی ریاست کا وجود نہ ہو تو نہ اجتماعی زندگی بر و تقویٰ سے آشنا ہو سکتی ہے اور نہ انفرادی زندگیوں ہی میں اس کا قائم رکھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہر ایماندار شہری کا فرض ہے کہ وہ بر و تقویٰ کے اس سب سے بڑے ادارہ کے کارکنوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے اور جب اس کی خدمات مطلوب ہوں تو ریاست کی خدمت پر اپنے ذاتی اغراض اور اپنی شخصی دلچسپیوں کو ترجیح نہ دے اور نہ اپنی کسی قابلیت و صلاحیت کو جس کی ریاست کو ضرورت ہو اس سے دریغ رکھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ محسوس کیا کہ لوگ حکومت کی ذمہ داریوں سے پہلو بچانے لگے ہیں تو آپ نے سب کو جمع کر کے ان کی ذمہ داری یاد دلائی کہ اگر آپ لوگ اس کام میں میری مدد نہیں کریں گے تو آخر میری مدد کے لئے کون لوگ آئیں گے۔ ان کی اس تقریر کے بعد سب نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی امداد کے لئے دل و جان سے حاضر ہیں[2]۔

مالی قربانی اسلامی ریاست کے ہر شہری کا چوتھا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق

[1] وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (مائدہ ۲) [2] حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ریاست کی ترقی اور اس کی حفاظت کے لئے مالی قربانی کرتا رہے۔ ہر شخص کے مال میں سے ایک حصہ ریاست کا حق تو اللہ تعالیٰ ہی نے مقرر کر دیا ہے جس کا ریاست کے بیت المال کو ادا کرتے رہنا واجب ہے۔ اس کے بعد ریاست اپنی حفاظت و ترقی کی اسکیموں کے لئے اگر لوگوں سے امداد کی اپیل کرے تو ہر ذی استطاعت شہری کا فرض ہے کہ وہ فراخدلی کے ساتھ ریاست کی امداد کرے۔ اس راہ میں اپنی پاکیزہ اور محنت کی کمائی میں سے جو پیسے بھی وہ خرچ کرے گا سب فی سبیل اللہ محسوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کا نعم عطا فرمائے گا۔

اگر خدانخواستہ ریاست کسی خطرہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کے تحفظ کے لئے بیش از بیش مالی قربانی کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں ہر وفادار شہری کا فرض ہے کہ اپنی ناگزیر اور اہم ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب ریاست کے تحفظ کے لئے پیش کر دے۔ اس طرح کے حالات کے لئے قرآن مجید میں مندرجہ ذیل حکم نازل ہوا ہے :-

یسئلونک ماذا ینفقون	اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں کس حد
قل العفو	تک خرچ کریں۔ ان کو بتا دو کہ جو ان کی ضرورت سے
(بقرہ ۲۱۹)	بچ رہے وہ سب۔

جانی قربانی ریاست کے تحفظ اور اس کے مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی تکمیل کے لئے ہر ذی صلاحیت شہری کا فرض ہے کہ وہ برابر مستعد اور تیار رہے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کے جذبہ سے معمور رہنا دلیل ایمان ہے اور اس جذبہ سے خالی ہونا نفاق کی علامت ہے اور اگر ریاست کے تحفظ کا سوال سامنے آ جائے تو جان کو عزیز رکھنا اور قربانی سے جی چرانا ایمان کی کھلی ہوئی موت ہے۔ پھر ان حالات کے اندر اسلامی ریاست نے

[2] (حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) کتاب الخراج صفحہ ۶۵۔ حضرت عمرؓ کے عہد حکومت کی یہ شان ملاحظہ ہو کہ لوگ سرکاری عہدوں کی ذمہ داریاں اٹھانے سے کتراتے ہیں اور لوگوں سے تعاون کی اپیل کرنی پڑتی ہے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی سرکاری عہدہ مل جاتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو دولت کونین ہاتھ آ گئی۔ اس تفاوت حال کی وجہ صرف تصور اور عقیدہ کا فرق ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ عہدے خدا کی امانت تھے اور اس کی بازپرس کے ساتھ ہی یہ قبول کئے جاتے تھے اور اسی احساس کے ساتھ نہایت قلیل معاوضہ پر ان کی ذمہ داریاں ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے سبب سے یہ لذیذ اور محبوب ہونے کے بجائے کڑوے کسیلے بن گئے تھے اور صرف وہی لوگ ان کو انجام دینے پر آمادہ ہوتے تھے جو فرض کی اہمیت کو پہچانتے ہوں اور آخرت کی امید پر ایک عبادت کی حیثیت سے ان میں اپنے آپ کو کھپانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے بالکل برعکس اس زمانہ میں یہ عہدے مطلق العنانی، جمطراق نفس اور عیش و تنعم کی تمام کششیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور خوف لوگوں کے اندر نہ قوم کی گرفت کا باقی رہا ہے نہ آخرت کی بازپرس کا۔ پھر اس بے فکر عیش کو حاصل کرنے کے لئے آخر لوگ کیوں نہ بازی لگائیں ؟

شہریوں سے اسلامی شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ریاست کو اس کے فرض دفاع اور فریضہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے پوری قوت بہم پہنچاتے رہیں اور خطرہ کی صورت میں اگر حکومت کی طرف سے "نفیر عام" (GENERAL MOBILISATION) کا اعلان ہو جائے تو ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو ریاست کے حوالہ کر دے کہ وہ جس طرح مناسب خیال کرے دفاع حق کی راہ میں اس کو صرف کرے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

کی حسب ذیل تصانیف

دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور میں

کتابت و طباعت کے مختلف مراحل طے کر رہی ہیں

۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار

کتابت مکمل ہو چکی ہے اور تصحیح کا مرحلہ طے ہو رہا ہے

۲۔ اسلامی ریاست

جو سلسلہ اسلامی ریاست کے سابقہ مطبوعہ حصص کے علاوہ بعض بالکل نئے مباحث پر مشتمل ہوگی۔

اس کی کتابت کا مرحلہ قریب الاختتام ہے

۳۔ تدبر قرآن کے اصول و آداب

زیر کتابت ہے

یہ تمام کتابیں ۲۲×۱۸/۸ سائز پر آفسٹ میں طبع ہوں گی، دعوت دین ۲۳۰ صفحات میں مکمل ہوئی ہے۔ اسلامی ریاست اندازاً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی اور تدبر قرآن تقریباً دو سو صفحات پر

ان کے علاوہ **تدبر قرآن** جلد دوم

جو تفاسیر سورۃ نساء، مائدہ، انعام اور اعراف پر مشتمل ہوگی، بھی زیر کتابت ہے — یہ جلد بھی ۲۰×۲۶/۸ کے اندازاً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اور انشاء اللہ ہر اعتبار سے سابقہ معیار ہی پر طبع ہوگی —

ہم نے قلت وسائل کے باوجود محض توکلاً علی اللہ اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا لیا ہے۔ ان کتابوں کے قدردان حضرات سے استدعا ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے — (خاکسار: اسرار احمد)

منشورِ اسلام (۴)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

(۷) نوع میں نصب العینوں کا ارتقاء

نصب العین کی محبت کا جذبہ نوع میں بھی شروع سے ہی اپنا اظہار کرنے لگ جاتا ہے۔ نوع انسانی میں بھی نصب العینوں نے قریباً اسی ترتیب کے ساتھ ارتقا کیا ہے جس ترتیب کے ساتھ وہ فرد انسانی میں ارتقا کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ فرد زندگی کی نفسیاتی سطح پر بھی نوع کی تاریخ کا اعادہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح وہ زندگی کی حیاتیاتی سطح پر اس کا اعادہ کرتا ہے۔

عہد قدیم کے انسان کے لئے اس کی اپنی جبلتی خواہشات (مثلاً بھوک کی تشفی کرنا، دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا، اشیاء کا مالک بننا، جنسی خواہش کو مطمئن کرنا وغیرہ) سے زیادہ کوئی چیز محبت کرنے اور ستائش کرنے کے لائق نہ تھی۔ ہر شخص کی محبت دیاں صرف اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتی تھیں۔ الا یہ کہ وہ بعض وقت اپنی حیوانی جبلتوں ہی کی خاطر ان کو دوسرے اشخاص تک وسعت دینے کے لئے مجبور ہو جائے۔ پھر کچھ مدت کے بعد وہ اپنے خاندان کے افراد سے ایک قسم کی دلچسپی اور کشش محسوس کرنے لگا اور اسے دوسرے خاندانوں سے الگ ایک وحدت سمجھنے لگا۔ جو اس کے نزدیک خاندان کے سب سے بڑے بزرگ اور دانا کے تحت قدرتی طور پر منظم تھی اور یہ بزرگ یا دانا خاندان کا سردار تھا۔ اس مرحلہ پر اپنی سود و بہبود کی بجائے خاندان کی سود و بہبود اس کا مقصود یا نصب العین بن گئی اور چونکہ خاندان کا سردار خاندان کی سود و بہبود کا نگران تھا وہ اس کی خوشنودی کے لئے اپنی جبلتی خواہشات میں جو پہلے اس کا مقصود تھیں، ردّ و بدل کو گوارا کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندان کے بعض مفاد کو قبیلہ کی عام بھلائی کے لئے قربان کرنا سیکھ لیا اور یہ قبیلہ جس کی علامت اس کا سردار تھا، اس کی محبت کا مقصود یا نصب العین بن گیا۔ پھر قبیلے بہت سے تھے اور آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا آخر کار ان کو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قبائلی جنگیں ظالمانہ اور تباہ کن ہیں۔ اور ان کی آرزوئے حسن کے لئے یہ بات زیادہ

تسلی بخش ہے کہ وہ ایک بادشاہ کے ماتحت متحد اور منظم ہو جائیں۔ لہٰذا اس بادشاہ کو ایک خاص ملک میں رہنے والی ایک قوم پر حکومت کرنے لگا۔ اور قوم کے نمائندہ کی حیثیت سے قوم کا مقصود اور نصب العین بن گیا۔ لیکن بادشاہ کی خود غرضیوں اور بے انصافیوں نے ان کی توجہ جلد ہی اس بات کی طرف مبذول کر دی کہ درحقیقت ان کی آرزوئے حسن کو ایسا نصب العین مطمئن نہیں کر سکتا جو ملک اور قوم کی خیر خواہی اور بھلائی کو نظر انداز کرتا ہو۔ لہٰذا ان کا نصب العین بادشاہ کی بجائے ملک یا ملک میں رہنے والی قوم قرار پایا۔ دوسرے الفاظ میں ان کا نصب العین ایک فردِ واحد کی عظمت سے جو ظل اللہ سمجھا جاتا تھا، گذر کر پوری قوم کی عظمت پر آ ٹھہرا۔ اور اس نے بادشاہت پرستی کی بجائے قومیت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ پھر قوم کی بھلائی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر خود حکومت کرے۔ لہٰذا ان کا نصب العین حسن کے معیار میں اور بلند ہو گیا اور وہ جمہوریت، آزادی، اخوت، مساوات اور حریت ایسے ناموں سے تعبیر ہونے لگا۔ تاہم ان اصطلاحات کا مفہوم زیادہ وسیع نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کا اطلاق انسانوں کے ایک محدود گروہ پر کیا جائے جو ایک قوم یا نسل کی حیثیت سے ایک خاص خطۂ زمین میں خاص جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوں اور فقط وہی ان سے مستفید ہوں۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد نوعِ انسانی کے نصب العینوں نے ایک نہایت ہی اہم قدم آگے اٹھایا۔ یعنی وہ انسان اور کائنات کے مکمل فلسفوں کی صورت میں آ گئے۔ مثلاً فسطائیت اور اشتراکیت جن میں سے ہر ایک کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہونے کا مدعی ہے۔

فرد کی طرح نوع میں بھی نصب العینوں کا ارتقا ٹھوس اشیاء سے تصوری حقائق کی سمت میں، غیر مستقل سے مستقل کی سمت میں، غیر مکمل سے مکمل کی سمت میں، متعدد سے واحد کی سمت میں، جزو سے کل کی سمت میں اور حسن نیکی اور صداقت کے پست درجوں سے ان کے بلند تر درجوں کی سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرد کے نصب العینوں کی طرح وہ بھی صحیح نصب العین کی سمت میں ارتقا کرتے ہیں۔

قائدین کا رول

عام طور پر ایک نصب العین کے حسن کا ذاتی احساس کسی ایسے قائد یا راہنما کے ساتھ گہرا نفسیاتی یا روحانی تعلق پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو اس نصب العین کی محبت سے پوری طرح سرشار ہو۔ اس قسم کا نفسیاتی تعلق ایسی حالت میں بھی بہت آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے جب کسی انسان کو ایک ایسی معاشرتی فضا میں رہنے کا اتفاق ہو جو نصب العین کی محبت سے پوری طرح معمور ہو۔ یعنی ایک ایسے معاشرہ میں جس کے افراد پہلے ہی اس نصب العین سے محبت کر رہے ہوں اور اس کی خدمت میں مصروف ہوں۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہماری کسی نظریاتی سوسائٹی کی ایک نسل کا نصب العین اس سے اگلی نسل کا نصب العین بن جاتا ہے۔ ایک نصب العین سے

چاہنے والے کے ساتھ نفسیاتی تعلق پیدا کرنا واحد طریق کار ہے جس کے ذریعہ سے ایک انسان نصب العین کی محبت میں اضافہ کر کے اس کو زیادہ قوی اور اس کی کیفیت کو اور گہرا کر سکتا ہے۔

تمام نصب العینوں کے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط قائدین بھی ہوتے ہیں اور متبعین بھی۔

ایک تہذیب کا عروج و زوال

جس طرح یہ ضروری ہے کہ ایک فرد کا غلط نصب العین زود یا بدیر شکست ہو جائے اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک منظم جماعت کا نصب العین بھی زود یا بدیر شکست ہو جائے۔ وہ کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن آخر کار اس کا مٹ جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نصب العین فقط ایک ذہنی تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل کا ایک پروگرام بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا حصہ اس کی پرستار سوسائٹی کی خارجی عملی زندگی میں منتقل ہوتا ہے۔ لہٰذا سوسائٹی کی عملی زندگی کے حالات اس کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ نصب العین کی باطنی جزئیات سوسائٹی کے حالات میں اس طرح ہو بہو نظر آتی ہیں جس طرح ایک بڑے آئینے میں اس کے سامنے کے منظر کی تفصیلات۔ یہ حقیقت سوسائٹی کو موقعہ دیتی ہے کہ وہ اس کے نقائص کو بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اگر نصب العین غلط ہو تو غلط قسم کے سماجی، اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی حالات پیدا کرتا ہے جو حسن، نیکی اور صداقت کے لئے ہماری فطری آرزو کو ناگوار ہوتے ہیں اور ہمیں نصب العین کے نقائص سے خبردار کرتے ہیں، ہمارے دلوں میں اس کی نفرت پیدا کرتے ہیں اور ہمیں اسے چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔

وہ سوسائٹی جو ایک غلط نصب العین سے محبت کرتی ہو، اس نصب العین کی طرف خدا کی چند صفات کو تو اپنی غلطی کی وجہ سے جان بوجھ کر اور شعوری طور پر منسوب کرتی ہے اور خدا کی باقی صفات کو نہ جانتے ہوئے اور غیر شعوری طور پر منسوب کرتی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو ان صفات کے عملی خارجی اظہار پر صرف کرتی ہے جن کی موجودگی کا وہ اپنی غلطی کی وجہ سے یہ سمجھتی ہے کہ وہ علم رکھتی ہے اور باقی صفات کو نظر انداز کرتی ہے اور ان کے عملی اظہار کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ لیکن یہی بات کہ وہ خدا کی اکثر صفات کو نظر انداز کرتی ہے اس کے لئے ناممکن بنا دیتی ہے کہ وہ خدا کی ان صفات کو اپنی خارجی عملی زندگی میں کامیابی سے ظاہر کر سکے جن کو وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتی۔ چونکہ وہ حسن، نیکی اور صداقت کی اکثر ضروریات سے بے پرواہ ہوتی ہے لہٰذا یہ حقیقت حسن، نیکی اور صداقت کی ان ضروریات سے مزاحمت کرتی ہے اور ان کی تشفی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے جن سے وہ بے پرواہ نہیں ہوتی۔ ایک غلط نصب العین کی فطرت کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ

دہ سوسائٹی کے حالات جو اس پر مبنی ہوں آخر کار زیادہ سے زیادہ بگڑتے چلے جائیں یہاں تک وہ سوسائٹی اپنی آخری تباہی تک پہنچ جائے اور ایسا ہو کر رہتا ہے خواہ سوسائٹی کے افراد بگڑتے ہوئے حالات کی روک تھام یا اصلاح کے لئے جو چاہیں جتن کیا کرتے رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر غلط نصب العین یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی چند صفات کو اس کی باقی ماندہ صفات سے الگ کرکے اور ان کی مدد کے بغیر سوسائٹی کی عملی زندگی میں آشکار کرے۔ حالانکہ حسن کی کوئی صفت اس کی دوسری تمام صفات کی مدد کے بغیر اور ان سے الگ ہو کر اپنا اظہار نہیں پا سکتی۔ حسن جس میں نیکی اور صداقت بھی شامل ہیں، ایک وحدت ہے وہ نہ تو حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے اور نہ حصوں میں آشکار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن وہ عمل جس سے غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ایک سوسائٹی اپنے نصب العین کے بیکار بلکہ خطرناک ہونے کا علم حاصل کرتی ہے بالعموم بڑا سست اور طویل ہوتا ہے اور کئی صدیوں تک پھیل جاتا ہے۔ ابتدائے عشق میں نصب العین کے چاہنے والوں کی امیدیں بہت بلند ہوتی ہیں۔ ان کی محبت تازہ اور پرجوش ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے نصب العین کی خدمت دل و جان سے کرتے ہیں اور اس کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے کہ وہ جس حسن کو اپنے نصب العین کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خارجی دنیا میں آشکار ہو۔ اس سے ان کی محبت اور بھی ترقی کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصب العین کی قوت بڑھتی رہتی ہے اس کا حلقۂ اثر پھیلتا رہتا ہے اور اس کی شان و شوکت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نصب العین عظمت کی اس انتہا کو پا لیتا ہے جسے پا لینے کی استعداد اس کی فطرت میں ہوتی ہے۔ قدرت ہر نصب العین کو بڑھنے اور پھولنے کا پورا موقع دیتی ہے اور ہر نصب العین ہر سمت میں اور ہر پہلو سے اتنی نشوونما پا لیتا ہے جتنی اس کی فطرت کی صلاحیتوں میں یا اس کے اوصاف و خواص میں بالقوہ موجود ہوتی ہے۔

کُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا

ہم سب کی مدد کرتے ہیں ان کی بھی اور ان کی بھی، آپ کے رب کی بخشش کی وجہ سے اور آپ کے رب کی بخشش محدود نہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ نصب العین کے پوشیدہ نقائص ان کی محبت پر مخالفانہ اثر پیدا کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے نصب العین سے چمٹے رہتے ہیں لیکن اس کے لئے ان کی ستائش کا جذبہ کمزور ہونے لگتا ہے اور ان کی محبت کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا ہونے لگتا ہے اور اب نصب العین پھیلنے سے رہ جاتا ہے اور اس کی قوت ترقی کرنے سے رک جاتی ہے اور وہ اسی قوت اور شان و شوکت کے سہارے جیتا ہے جو وہ پہلے حاصل کر چکا ہوتا ہے اور روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے لہٰذا اس کے چاہنے والے بھی دن بدن اس کے لئے

اپنی محبت کھوتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ایک بیرونی کچل دینے والا حملہ یا ایک اندرونی کامیاب انقلاب اسے ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ اور ایک اور نصب العین اس کی جگہ لینے کے لئے ابھر آتا ہے۔ یہ ہے قدرت کا وہ عمل جس کے ذریعہ سے ثقافتیں اور تہذیبیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی نصب العین کے گرد وجود میں آتی ہے ترقی کرتی ہیں اور اپنی ترقی کی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں اور پھر زوال پاتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں اور نئی ثقافتیں اور تہذیبیں ان کی جگہ لیتی ہیں اور پھر تاریخ کے اسی عمل کو دہراتی ہیں اور یہ ہے قدرت کا وہ قانون جس سے تاریخ کا عمل انسان کو اس کی فطرت کے نصب العین کی طرف جو نوعِ انسانی کا آخری نصب العین ہے آگے دھکیلتا چلا جا رہا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ
مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا
الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ
وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو تباہ کر دیا ہے جن کو ہم نے زمین پر اس طرح سے متمکن کیا تھا کہ تم کو بھی ویسا نہیں کیا۔ ہم نے بادلوں کو بھیجا کہ ان پر موسلا دھار مینہ برسائیں اور دریاؤں کو ان کے نیچے جاری کیا اور ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے نیست و نابود کر دیا اور ان کے بعد ایک اور نسل پیدا کی۔

نصب العینوں کی جنگ

چونکہ کسی قوم کا نصب العین ایک ایسا تصور ہوتا ہے جو اس کے اپنے خیال کے مطابق انتہائی حسن اور انتہائی کمال سے مزین ہوتا ہے اور وہ قوم چاہتی ہے کہ اپنے نصب العین کے حسن اور کمال کو پوری طرح سے آشکار کرے لہٰذا وہ اس کام کو بخیر و خوبی انجام دینے کے لئے اپنے آپ کے لئے غیر محدود قوت اور حلقۂ اثر کی غیر محدود وسعت چاہتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ غیر محدود قوت اور غیر محدود حلقۂ اثر صرف دوسرے تمام نصب العینوں کی قیمت پر ہی اور ان کو نقصان پہنچا کر ہی حاصل کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر ریاست بالقوہ اور اپنی فطرت کی بنا پر دوسری تمام ریاستوں کی دشمن اور بدخواہ ہوتی ہے اور جس لمحہ وجود میں آتی ہے اسی لمحہ سے ان سب کے ساتھ برسرِپیکار ہو جاتی ہے۔ یہ پیکار کبھی آشکار ہوتی ہے اور کبھی پنہاں۔ کبھی تشدد آمیز ہوتی اور کبھی پُرامن۔ کبھی میدانِ جنگ کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی مجلس یا کانفرنس کی اور کبھی کسی عہد نامہ کی یا خیرسگالی کے مشن

کی۔ لیکن یہ پیکار ہر ریاست کے لئے زندگی اور موت کی جنگ ہوتی ہے جو اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ وہ خود مٹ نہیں جاتی یا دوسری تمام ریاستوں کو مٹا نہیں دیتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکار کے باوجود بعض ریاستوں میں مشترک مقاصد حاصل کرنے کے لئے گہری دوستیاں پیدا ہو جائیں جو طویل عرصوں تک جاری رہیں لیکن ریاستوں کی ایسی دوستیاں صرف اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک ان کے نصب العینوں کے مفاد ایک دوسرے سے کھلم کھلا نہیں ٹکراتے۔ تاہم ان کے مفاد کا مخفی تضاد ہمیشہ موجود رہتا ہے اور ان کی زندگی میں بار بار آشکار ہوتا رہتا ہے۔

اس طرح ہر غلط نصب العین زود یا بدیر ٹوٹ جاتا ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اس کے مخفی اندرونی تضادات یا نقائص آشکار ہو کر اسے توڑ دیتے ہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ دوسرے نصب العینوں کو ماننے والی قومیں اسے باہر سے کاری ضربیں لگا کر کچل دیتی ہیں۔ جب کسی نصب العین کو ماننے والی قوم بیرونی حملوں کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے تو وہ اس بات پر غور کرنے لگتی ہے کہ آیا اس کا نصب العین ہی تو اس کی شکستوں اور ناکامیوں کا باعث نہیں۔ گویا ایسی حالت میں اگر نصب العین درحقیقت غلط اور ناقص ہو تو قوم اس کے نقائص سے جلد تر باخبر ہو جاتی ہے۔

جذبۂ لاشعور کی حقیقت

نصب العین کی محبت کا جذبہ جو انسان کا امتیاز ہے درحقیقت اس کے لاشعور کا جذبہ ہے جو تجزیۂ نفس کے ماہرین کے تجربات کے نتیجے کے طور پر اب انسان کے تمام اعمال و افعال کی قوت محرکہ تسلیم کیا گیا ہے افسوس ہے کہ تجزیۂ نفس کے ماہرین نے جذبہ لاشعور کی حقیقت کو پوری طرح سے نہیں سمجھا اور اس کی کئی متضاد قسم کی توجیہات کی ہیں۔ مثلاً فرائڈ کے خیال میں یہ جذبہ جنسی خواہش ہے۔ ایڈلر کا خیال ہے کہ اس کی حقیقت قوت یا غلبہ کی ایک خواہش ہے اور یونگ سمجھتا ہے کہ یہ جنسی خواہش بھی ہے اور غلبہ کی خواہش بھی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ جذبہ حسن اور کمال کی ایک خواہش ہے جو کسی ایسے نصب العین کی محبت سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔ چونکہ اس قسم کا ایک نصب العین یہ استعداد رکھتا ہے کہ انسان کے لاشعور میں محبت کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ اسے تمام و کمال اپنے تصرف میں لے لے اور کام میں لائے۔ وہ انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر متحد اور منظم کر دیتا ہے اور اس کے مکمل اطمینان قلب اور انبساط کا موجب ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ صرف دماغی اور اعصابی امراض کے انسداد اور علاج کے لئے اور اخلاقی بیماریوں کو روکنے اور دور کرنے کے لئے بلکہ نوع انسانی کی معاشرتی اور سیاسی مشکلات کے حل کرنے کے لئے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

محبت کی یا اپنے آپ کے علم کی ترقی اور اس کا تنزل

ایک نصب العین کی محبت جب تک عمل میں ظاہر نہ ہو وہ سچی محبت نہیں ہوتی بلکہ محض خود فریبی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حد تک کسی شخص کی زندگی کے اعمال و افعال اس نصب العین سے پیدا نہیں ہوتے جس کی محبت کا وہ دعویٰ زبانی کر رہا ہے وہ یقیناً کسی اور نصب العین سے پیدا ہو رہے ہوتے ہیں اور وہی نصب العین درحقیقت اس کے دل پر قابض ہوتا ہے اور اس کا زبانی دعویٰ غلط ہوتا ہے۔

کسی نصب العین کی سچی اور حقیقی محبت کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ وہ کم و بیش یا تو بڑھ رہی ہوتی ہے یا کم ہو رہی ہوتی ہے۔ جب وہ کم ہو رہی ہوتی ہے تو بیک وقت اس کے ساتھ ہی ایک اور نصب العین کے اصلی یا فرضی حسن کا انکشاف عمل میں آ رہا ہوتا ہے اور فرد کا عمل بھی اسی انکشاف کی نسبت سے اس نصب العین کی طرف منتقل ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر ایسا انکشاف عمل میں نہ آ رہا ہو تو پھر فرد ان وجوہات کی بنا پر جن کی تشریح اوپر کی گئی ہے ایک المناک ذہنی تجربہ میں سے گذر رہا ہوتا ہے جو ایک اعصابی خلل یا صدمہ یا کم از کم ایک ذہنی پریشانی کی صورت میں ہوتا ہے۔

چونکہ نصب العین کی محبت کے جذبہ کی رکاوٹ یا مایوسی کی حالت ایک انسان کے لئے الم ناک اور ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ انسان کوشش کرتا ہے کہ اس حالت کو کسی قیمت پر پیدا نہ ہونے دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے خلاف کوئی معقول دلائل بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور یہ چاہتا ہے کہ ہر حالت میں اپنے نصب العین کے ساتھ چمٹا رہے اور اس بات کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ بجا طور پر یہ کہیں گے کہ وہ ضدی اور نامعقول ہے

اس کے برعکس اگر نصب العین کی محبت ترقی کر رہی ہو تو پھر یہ اپنے معمول اور قدرتی راستہ پر ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان کو کوئی تکلیف یا زحمت نہیں ہوتی۔ جب تک ایک نصب العین کی محبت کسی دوسرے نصب العین کی محبت سے نہیں ٹکراتی وہ برابر ترقی کرتی رہتی ہے اور جب ٹکراتی ہے تو بالعموم مغلوب ہو کر مٹ جاتی ہے اور دوسرے نصب العین کی محبت اس کی جگہ لے لیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت اظہار کا تقاضا کرتی ہے اور جب عاشق کسی قدر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ گویا اسے اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کے قوائے فکر و عمل کو اور لہٰذا اس کی پوری شخصیت کو ذرا اور اپنے تصرف میں لے لے۔ محبت کا ہر اظہار خواہ وہ خیال میں ہو یا لفظ میں یا عمل میں انسان کے ذخیرۂ محبت کا ایک اور جزو اس کے شعور کی گہرائیوں سے نکال کر اس کے نصب العین کے ساتھ پیوست کر دیتا ہے اور اس طرح سے نصب العین کی محبت کو ترقی دیتا ہے۔

محبت کی نشو و نما کے طریقے

ہر نصب العین کی محبت خواہ نصب العین صحیح ہو یا غلط دو طریقوں سے اظہار پا کر نشو و نما پاتی ہے۔

اوّل: نصب العین کے حسن پر داخلی غور و فکر جو نصب العین کی ستائش اور پرستش کی صورت اختیار کرتا ہے اس عمل میں نصب العین کے عمدہ اور دل کش اوصاف میں سے زیادہ سے زیادہ اوصاف پر اور ان میں سے ہر وصف پر زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لئے توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ عمل نصب العین کے حسن کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصب العین کے حسن کا احساس اور گہرا ہو جاتا ہے۔

ہر قوم یا نظریاتی جماعت اپنے افراد کو نصب العین کے حسن پر غور و فکر کرنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے مختلف قسم کے طریقے استعمال کرتی ہے۔ ان سب طریقوں کے مجموعہ کو ہی وسیع معنوں میں قوم کا نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔ ایسے نظام تعلیم کے تعلیمی ذرائع میں ہمیں نہ صرف قومی اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بلکہ گرجوں، مندروں، مسجدوں، خوموں، کلبوں، اخباروں، رسالوں، کتابوں، جلسوں، جلوسوں، تقریروں اور سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے علاوہ سینما، تھیٹر اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کو بھی شمار کرنا چاہیئے۔ ان غلط نصب العینوں کی صورت میں جو نصب العین کی قائم مقام حیثیت اختیار کرنے والی شخصیتوں اور چیزوں کی پرستش پر زور دیتے ہیں، محبت کو فروغ دینے والے ان طریقوں میں قومی لیڈروں کی حنوط کی ہوئی لاشوں بتوں اور تصویروں اور قومی جھنڈوں کی نمائشوں اور تمام سماجی، سیاسی اور فوجی مظاہروں کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے جن کا اہتمام یا تو ریاست خود کرتی ہے یا ریاست کی حوصلہ افزائی سے عمل میں آتا ہے۔

دوم: نصب العین کی خدمت اور اعانت کے لئے خارجی عمل جس کی وجہ سے نصب العین کے ساتھ نصب العین کے چاہنے والے کا دلی تعلق اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اس کے حسن کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اور اس کی محبت اور ترقی کر جاتی ہے۔ نصب العین کی خدمت اور اعانت کے لئے عمل ہمیشہ نصب العین کے اخلاقی قانون کے ماتحت سرزد ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ عمل اس قانون کی متابعت ہی کا دوسرا نام ہے۔

محبت کی ترقی ہمیشہ اس عمل کی نسبت سے ہوتی ہے جو نصب العین کی متابعت میں سرزد ہو

نصب العین کی محبت کی مسلسل اور کامل نشو و نما کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اوصاف و خواص جس عمل کا تقاضا کرتے ہوں وہ فرد کی پوری قدرتی عملی زندگی کو اپنے احاطہ میں لینے والا ہو اور اس زندگی

کے تمام ضروری شعبوں مثلاً سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، قانونی، علمی اور فنی شعبوں پر حاوی ہونا چاہئیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فرد کی قدرتی عملی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا ہو جو اس کے نصب العین کے دائرۂ تصرف سے باہر رہ جاتا ہو تو پھر یہ شعبہ لازماً ایک ایسے نصب العین کے تصرف میں چلا جاتا ہے، جو اُس نصب العین کا نقیض ہوتا ہے اور جو فرد کے لاشعور کی محبت کا کچھ حصہ جو اس نصب العین کے کام آنے والا ہوتا ہے کاٹ کر اپنے کام میں لے آتا ہے اور لہٰذا اس نصب العین کی محبت اسی قدر کم رہ جاتی ہے۔ صرف وہی نصب العین ہمارے لاشعور کی پوری محبت کو اپنے کام میں لا سکتا ہے جو اپنی سرشت اور اپنے اوصاف و خواص کی وجہ سے ہماری قدرتی عملی زندگی کے ہر شعبہ میں حکمرانی کا مدعی ہو اور اس میں صرف اپنے ہی قانون اخلاق کے مطابق عمل کا مطالبہ کرتا ہو۔

انسان کی حیات بعد الممات

چونکہ کائنات کی آخری حقیقت شعور ہے اور مادہ نہیں اور چونکہ شعور نے جسم انسانی کو پیدا کیا ہے اور جسم نے شعور کو پیدا نہیں کیا۔ انسانی شعور انسانی جسم کے مرنے کے بعد مرتا نہیں۔ لہٰذا اس زندگی میں اس کے نصب العین کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس کی بعد از مرگ زندگی کی کیفیت کو بھی معین کرتی ہے۔ جو آدمی اپنے نصب العین کی درستی اور عمدگی اور زیبائی اور اس سے پیدا ہونے والے اعمال کی وجہ سے اس دنیا میں مسرور اور مطمئن اور ترقی پذیر ہو وہ اگلی دنیا میں بھی اپنے نصب العین کی ان ہی خصوصیات اور ان سے پیدا ہونے والے اعمال کی وجہ سے مسرور اور مطمئن اور ترقی پذیر ہوتا ہے اور اگر اُس کا نصب العین اس دنیا میں ان خصوصیات سے عاری ہو تو وہ نہ یہاں مسرور اور مطمئن اور ترقی پذیر ہوتا ہے اور نہ اگلی دنیا میں۔

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ (۸۹ : ۲۸)

اے مطمئن جان اپنے رب کی طرف لوٹ جا تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے

ومن کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی واضل سبیلا (۱۷ : ۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور اس دنیا سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

(بقیہ صفحہ ۸ سے آگے)

اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔"

ایک دوسری روایت میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس روایت کا ترجمہ بھی یہاں دیئے دیتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لئے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے (مسلم کے الفاظ ہیں کہ) نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی۔ مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہش میرے لئے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے ؟ اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے ؟

اس کو اپنے لئے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادّی خوشیاں اور تمام مادّی لذّتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لئے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس کو اس نے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لئے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لئے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات وخصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجئے ایک نیکی سازگار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیئے وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہوگا۔ اور ہر حقدار اس اجر کو حاصل کرے گا۔ لیکن روزے کی جو عبادت ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہوگا جس کا علم صرف اسی کو ہے

تاریخ تصوف اسلام

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ابوالمغیث حسین ابن منصور

الحلّاج المصلوب

(۲)

پروفیسر نکلسن نے اپنی تصنیف "صوفیائے اسلام" مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء میں لکھا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے آغاز (۹۲۲ء) میں حلاج کو بڑے وحشیانہ طریق سے قتل کیا گیا اس کے قتل کی وجوہ زیادہ تر سیاسی تھیں مگر ان سے یہاں کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس نے دو لفظوں میں ایک ایسا جملہ اپنی زبان سے ادا کیا جسے اسلام نے معاف تو کر دیا ہے مگر فراموش نہیں کیا ——— "انا الحق" یعنی میں خدا ہوں۔

پروفیسر لوئی ماسینیون نے حلاج کی تصنیف کتاب الطواسین مطبوعہ پیرس ۱۹۱۳ء کے مقدمے میں جو تحقیق اینق درج کی ہے اس کی روشنی میں پہلی مرتبہ یہ بات ممکن ہو سکی ہے کہ حلاج کے صحیح مفہوم سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ یعنی جب حلاج نے انا الحق کہا تھا تو خود اس کی اس جملے سے کیا مراد تھی۔ یقیناً اس کی مراد وہ نہیں تھی جو متاخرین نے بیان کی۔

حلاج کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے لاہوتی (DIVINE) یا الٰہی ہے خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی ذات سے "اپنی محبتِ ابدی کا پیکر باہر نکالا تاکہ وہ اس (پیکر) میں اپنے آپ کو اسی طرح دیکھ سکے جس طرح ایک جمیلہ اپنی صورت آئینے میں دیکھتی ہے (اور مسرور ہوتی ہے) اسی لئے خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں کیونکہ اس میں وہ خود حلول کر گیا تھا جس طرح اس نے بعد ازاں جسم مسیح میں حلول کیا تھا۔ کما قال الحلاج ؎

"پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی ناسوتی شکل میں اپنی منور لاہوتی ذات کو ظاہر کیا اور پھر وہ اپنی مخلوقات کے سامنے ایک کھانے اور پینے والے انسان (مسیح) کی شکل میں ظاہر ہوا۔"

چونکہ خدا کی انسانیت (ناسوت) انسان کی پوری جسمانی اور روحانی طبیعت (نیچر) کو شامل ہے۔ اس لئے خدا کی الوہیت (لاہوت) انسانی طبیعت کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی جب تک تجسّم کی صورت اختیار نہ کی

جائے۔ پروفیسر ماسینیون نے اس کے لئے حلول (INFUSION) کی اصطلاح کو ترجیح دی ہے۔ یعنی (روحِ ایزدی) اسی طرح انسان میں حلول کر گئی جس طرح روحِ انسانی کسی انسان میں حلول کر جاتی ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کو حلاج نے ان اشعار میں واضح کر دیا ہے:

"تیری روح میری روح میں اسی طرح گھل مل گئی ہے جس طرح شراب صاف پانی میں گھل مل جاتی ہے (اور اس طرح دونوں ایک ذات ہو گئے)

"کوئی شے جب تجھے مس کرتی ہے تو وہ مجھے مس کرتی ہے۔ کیا مزے کی بات ہے کہ ہر حال میں تو "میں" ہے۔ نیز کہتا ہے:

"میں وہی تو ہوں جسے میں چاہتا ہوں، (محبت کرتا ہوں) اور وہ جس سے میں محبت کرتا ہوں، میں ہے ہم دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں بستی ہیں۔ اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو گویا اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔"[1]

کسی شخص کو الوہیت کے مرتبے پر پہنچا دینا یا خدا بنا دینے کا عقیدہ جس انداز سے حلاج نے پیش کیا ہے یہ انداز نصاریٰ کے عقیدۂ تجسیم سے مشابہ ہے اور اس لئے بلاشبہ مسلمانوں کی نظر میں کفر صریح ہے۔ حلاج کے جن شاگردوں نے یہ عقیدہ اختیار کیا وہ حلولیہ کہلاتے ہیں اور صوفیہ نے علما کی طرح بڑی شدت کے ساتھ ان کا رد کیا ہے۔

اگرچہ ایران میں بادشاہوں کو الوہیت کا درجہ دیا جاتا تھا اور ایرانیوں میں تجسیم، حلول، تشبیہ اور تناسخ ارواح کے عقائد بھی مروج تھے اور ان کی نگاہ میں کسی انسان کو الوہیت کا درجہ دے دینا چنداں قابل اعتراض نہ تھا۔ مگر ایسا تصوف جو اسلامی ہونے کا مدعی ہو، حلاج کی تعلیم کو قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ ذاتِ ایزدی اور ذاتِ انسانی دونوں آپس میں شیر و شکر ہو گئیں عقیدہ توحید باری کی نفی کرنا ہے۔

پروفیسر ماسینیون نے کتاب الطواسین کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ابن عربی رح نے حلول کی تعلیم نہیں دی (بلکہ وحدت وجود کی تعلیم دی ہے جو حلول سے قطعاً مختلف ہے) کیونکہ ان کی رائے میں قدیم اور حادث ۔ الواحد کی دو شئون متممہ ہیں (ایسی شانیں ہیں جو ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں) اور باہم دگر لازمی ہیں۔ مخلوقات خالق کے خارجی مظاہر ہیں اور انسان وہ سِرِّ ایزدی ہے جو بواسطہ مخلوق ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن انسان چونکہ محدود ذہن رکھتا ہے اور جملہ معروضاتِ فکر کا بیک وقت ادراک نہیں کر سکتا اس لئے وہ بیک وقت سِرِّ ایزدی کے

[1] قارئین دھوکا نہ کھائیں یہ وحدۃ الوجود نہیں ہے بلکہ حلول یا اتحاد ہے کیونکہ حلاج باربار دوئی کا اعلان و اعتراف کرتا ہے۔ وحدۃ الوجود کی رو سے دوئی محال ہے کیونکہ موجود فی الحقیقت اللہ ہے یہ کائنات اس کی تجلیات کا دوسرا نام ہے۔ (مرتب)

صرف کسی ایک جزو کا اظہار کر سکتا ہے لہٰذا وہ کبھی بھی "انا الحق" نہیں کہہ سکتا۔ وہ بجائے "ازحقائق" (ایک حقیقت) تو ہے مگر الحق (کُل حقیقت) نہیں ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوسرے صوفیوں نے مثلاً رومی نے اپنی تحریروں میں اس نازک فرق کو جو حلول اور وحدۃ الوجود کے درمیان متحقق ہے، نظرانداز کر دیا۔[1] تاہم صوفیوں نے حلول اور اتحاد دونوں عقیدوں کی تردید کی ہے۔ اسلامی تصوف نہ خدا کسی انسان میں حلول کر سکتا ہے نہ کسی انسان سے متحد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابونصر سراج نے اپنی تصنیف "کتاب اللمع" میں ان دونوں عقیدوں کا رد کیا ہے۔" (مقتبس از صوفیائے اسلام مولفہ نکلسن مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۷)

(۲) پروفیسر مذکور اپنی دوسری تصنیف "تصوف میں شخصیت کا تصور" میں لکھتا ہے:

"جب حلاج کو عدالت میں پیش کیا گیا تو ارکان عدالت نے کہا کہ اس پر فرد جرم عائد کرنی چاہیئے کیونکہ اس نے لکھا ہے کہ حج کعبہ فرض نہیں ہے بلکہ لائق تنسیخ ہے اس کے علاوہ وہ قرامطہ سے خفیہ طریق پر واسطہ رکھتا رہا ہے۔ نیز اس کا یہ کہنا کہ میں خدا سے متحد ہو گیا ہوں اگرچہ اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی نہ تھا مگر اس عقیدۂ اتحاد کو جس انداز سے اس نے پیش کیا تھا وہ بلاشبہ مسلمانوں کی نظر میں قابل نفرت و ملامت تھا۔"

انا الحق کا جملہ حلاج کی ایک غیر معمولی تصنیف "کتاب الطواسین" میں مرقوم ہے جسے پروفیسر لوئی ماسینیون (فرانسیسی مستشرق) نے ۱۹۱۳ء میں تصحیح کے بعد شائع کیا تھا۔ یہ کتاب مسجع عربی نثر میں لکھی گئی ہے۔ اور گیارہ مختصر فصول پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حلاج نے عقیدۂ ولایت کی تلقین کی ہے جو اس کے ذاتی تجارب (مشاہدہ) پر مبنی ہے اس نے اپنے اس عقیدے کو بڑے دقیق منطقی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ طرز نگارش یا اسلوب بیان اس قدر مبہم اور فنی مصطلحات سے معمور ہے کہ شروح کے مطالعے کے بعد بھی قاری یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ مصنف کا مفہوم سمجھ گیا۔ ماسینیون کے مقدمے کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "انا الحق" محض ایک نعرۂ مستانہ نہیں تھا بلکہ حلاج نے یہ جملہ بہت غور و خوض کے بعد سپرد قلم کیا تھا اور اس جملے میں حلاجی فلسفہ اسی طرح مضمر ہے جس طرح اسلام کلمہ توحید میں۔ حلاج کا یہ فکری نظام (الہیات تصوف) بڑی ندرتِ فکر کا حامل ہے اس کے افکار کی گہرائی اور کارفرمائی کا اندازہ اس اثر سے کیا جا سکتا ہے جو صوفیائے مابعد کے خیالات و اذہان پر مرتب ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے مخالفین نے اس کو مصلوب کر کے اس کی راکھ بھی ہوا میں اڑا دی مگر وہ اس کے خیالات کو اور اس کے ان دو لفظوں کو دنیا سے اور دنیا والوں کے ذہنوں سے نہ مٹا سکے۔ انا الحق کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جا سکتی ہے۔

[1] نکلسن کے اس تبصرے کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو استدراک از مولف در آخرِ ایں فصل

آدم بر سرِ مطلب۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ جب حلاج نے انا الحق کہا تو اس قول سے اس کا مطلب کیا تھا! صوفیہ الحق سے ذاتِ باری مراد لیتے ہیں جو خالق کائنات ہے اور الخلق سے مبائن (مختلف) ہے۔ یہاں الحق سے خالق ہی مراد ہے۔ چنانچہ ماسینوں نے اس کا ترجمہ الحق الخالق (THE CREATIVE TRUTH) ہی کیا ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتا ہے :-

"اگرچہ حلاج خدا کی ورائیت کا قائل ہے تاہم وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ خدا کی ذات انسان کی رسائی سے بالاتر ہے۔ قدیم یہودی اور نصرانی روایت سے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ حلاج نے تخلیق کا وہ عقیدہ مستنبط کیا جس کی مثل یا نظیر عقیدہ "تالّہ" یا تالیہ (DEIFICATION) میں موجود تھی۔ جو انسان الوہیت کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے (الوہیت مآب ہو جاتا ہے) وہ زُہد کی بدولت صورتِ ایزدی کی اس حقیقت کو جو خدا نے اس پر منقش کر دی ہے اپنے باطن میں دیکھ لیتا ہے۔ ہمارے پاس حلاج کی ایسی کئی تحریریں ہیں جن کی بدولت ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ حلاج لکھتا ہے "تمام اشیاء کی تخلیق سے پہلے بلکہ علمِ تخلیق سے بھی پہلے خدا اپنی حالتِ وحدت میں اپنے ساتھ ناقابلِ بیان طریقے سے مصروفِ گفتگو تھا۔ اور تجود، در خود، اپنی ذات کی عظمت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی اس تحسین خویش کی خاص سادگی کا دوسرا نام عشق یا محبت ہے جو اس کی اپنی ذات کے اعتبار سے ذات کی ذات ہے اور جو صفات کی تمام تحدید سے ورا ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ اپنی خلوت کاملہ میں خدا اپنی ذات پر عاشق ہے۔ اپنی حمد و ثنا کرتا ہے۔ اور عشق کے ذریعے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ ذاتِ مطلق میں عشق کے ظہور اولیں نے اسما و صفات ایزدی کی کثرت کو متعین کیا۔ اس کے بعد خدا نے تجود، در خود اپنی ذات سے اپنی اس مسرت عشقی کو — اس عشق در خلوت کو خارجی وجود عطا کیا تاکہ وہ دیکھ سکے اور اس سے دو بدو گفتگو کر سکے۔ اس نے اپنے آپ کو آئینۂ سرمدیت میں دیکھا اور عدم سے اپنا عکس یا نقش (IMAGE) پیدا کیا۔ پھر اسے اپنے اسما اور اپنی صفات عطا کیں جسے آدم کہتے ہیں۔ خدا نے اس پر اپنی نگاہ ڈالی اور اس نگاہ نے آدم کے نقش کو خدا کا ابدی نقش بنا دیا۔ خدا نے صورتِ آدم پر (جو اسی کی صورت تھی) اپنا سلام بھیجا، اس کی ثنا کی اسے مجتبےٰ بنایا اور اس لحاظ سے کہ اس نے صورتِ آدم میں اور اس کے ذریعے سے اپنے آپ کو ظاہر کیا، وہ صورت مخلوق ہُوَ ہُوَ (اللہ) بن گئی۔" (کتاب الطواسین صفحہ ۱۲۹)

حلاج نے ان اشعار میں آدم اور عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے :-

"پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی انسانیت (ناسوت) میں اپنی شعاع گستر الوہیت (لاہوت) کا راز ظاہر کیا۔ پھر وہ اپنی مخلوقات پر ایک کھانے اور پینے والے شخص کی شکل میں ظاہر ہوا۔" (کتاب الطواسین صفحہ ۱۳۰)

ان شعروں میں خدا کی دو ذاتوں کا ذکر ہے اور اسی عقیدے کی تعلیم دی گئی ہے۔ خدا میں ایک تو خدائی ذات (لاہوت) ہے دوسری انسانی ذات (ناسوت) ہے۔ لاہوت اور ناسوت کی یہ اصطلاحیں حلاج نے سریانی نصرانیت سے مستعار لی ہیں۔ مزید برآں یہ کہ حلاج نے لاہوت اور ناسوت (بقول حلاج خدائی روح اور انسانی روح) کے اتحاد کے لئے حلول کی اصطلاح استعمال کی ہے اور یہ اصطلاح مسلمانوں کے ذہنوں میں نصرانیوں کے عقیدہ تجسیم مسیح سے وابستہ ہے ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حلاج کی نظموں میں اس کی روح اور خدا کی روح دونوں عاشقوں کی طرح سرگرم راز و نیاز نظر آتی ہیں۔

"اے خدا! تیری روح میری روح سے اس طرح ممزوج ہو گئی ہے جس طرح شراب خالص پانی میں مل جاتی ہے۔ جب کوئی شے تجھے مس کرتی ہے تو گویا مجھے مس کرتی ہے کیا تماشا ہے کہ ہر حال میں، تو میں ہے (اور میں تو ہوں) (کتاب الطواسین صفحہ ۱۳۴) دوسری نظم میں کہتا ہے :-

"میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں (جس سے میں محبت کرتا ہوں) اور جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میں ہے۔ ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں رہتی ہیں۔ اے مخاطب اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔" (کتاب الطواسین صفحہ ۱۳۴)

حلاج نے فرعون اور ابلیس کو بھی موحدِ اعظم قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے :-

"جب خدا نے ابلیس کو ڈرایا کہ اگر تو آدم کو سجدہ نہیں کرے گا تو میں تجھے جہنم میں ڈال دوں گا تو ابلیس نے کہا اے خدا کیا سزا دیتے وقت تو مجھے سزا پاتے ہوئے نہیں دیکھے گا؟ خدا نے اثبات میں جواب دیا، تو ابلیس نے کہا پھر میں تجھے دیکھنے میں ایسا محو ہو جاؤں گا کہ مجھے عذاب کا احساس ہی نہ ہو گا۔" (کتاب الطواسین مقدمہ صہ۱۲) دوسرے مکالمے میں جب موسیٰؑ نے ابلیس کو سرزنش کی تو اس نے کہا "اے موسیٰ تمہیں نہیں معلوم وہ امر نہیں تھا بلکہ میرا امتحان تھا (کتاب الطواسین صفحہ ۴۶) چنانچہ ابلیس خدا سے کہتا ہے "مجودی لک تقدیس" یعنی تیری نافرمانی میں میں نے تیری تقدیس کی (کتاب الطواسین صفحہ ۴۳) دوسری جگہ حلاج اپنے مخالفین سے کہتا ہے :-

"اگر تم خدا کو نہیں پہچانتے تو کم از کم اس کی آیات کو تو پہچانو۔ میں وہ آیت ہوں۔ میں الحق الخالق (THE CREATIVE TRUTH) ہوں کیونکہ حق کے واسطے سے میں بھی ازلی حق ہوں۔ ابلیس اور فرعون میرے معلّم ہیں۔ ابلیس کو خدا نے نارِ جہنم سے ڈرایا مگر اس نے توبہ نہیں کی (انکار پر قائم رہا) فرعون غرق ہو گیا مگر اس نے بھی توبہ نہیں کی۔ اسی طرح خواہ مجھے قتل کر دیا جائے میرے ہاتھ پاؤں قطع کر دیئے جائیں اور مجھے مصلوب کر دیا جائے مگر میں توبہ نہیں کروں گا (انا الحق کا انکار نہیں کروں گا) (کتاب الطواسین صفحہ ۵۱ و ۵۲)

لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ حلاج ابلیس کی فتوت (ذاتی قربانی) کی تعریف کرتا ہے مگر امرِ رب کی نافرمانی پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ ابلیس نے اپنے طرزِ عمل کے جواز میں یہ بات کہی کہ میرا انکار تو مقدر تھا۔ اگرچہ خدا نے مجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا مگر اس کی مشیت یہی تھی کہ میں انکار کروں ورنہ میں ضرور اطاعتِ حکم کرتا، کیونکہ خدا جس بات کا ارادہ کرتا ہے وہ ضرور وقوع پذیر ہوتی ہے۔" حلاج نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اطاعت تو ایک مقدس فریضہ ہے۔ امر ایک حقیقت ازلی ہے جبکہ مشیت (ارادہ) اور اس کے متعلق خدا کا علم (کہ اس امر کی تعمیل ہوگی یا نہیں) یہ دونوں حادث ہیں اس لئے امر کے تحت ہیں اور ان کا مرتبہ کمتر ہے۔ مثلاً نیکی اور بدی دونوں خدا ہی کی مشیت سے سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن وہ امر صرف نیکی ہی کا کرتا ہے وہ ہمیں ایک کام کا حکم دیتا ہے اور جانتا ہے کہ ہم اس کو نہیں کرسکتے۔ وہ ارادہ کرتا ہے کہ ہم گناہ یا بدی کریں۔ مگر وہ یہ نہیں ارادہ کرتا کہ ہم اپنے جرم کی بدولت بدی کریں یعنی دیدہ و دانستہ عمداً گناہ کریں۔ کتاب الطواسین صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

لیکن حلاج مسئلہ جبر و اختیار کی مشکل سے بخوبی آگاہ تھا۔ چنانچہ کہتا ہے :-

"خدا نے اسے سمندر میں پھینک دیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اس سے کہا دیکھو ہوشیار ہوجاؤ میاں! تم پانی میں تر ہوجاؤ۔" (وفیات الاعیان مولفہ ابن خلکان)

(مقتبس از تصور شخصیت فی التصوف مؤلفہ پروفیسر نکلسن صفحہ ۳۶ تا ۴۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء)

(۴) دکتور ابیر نصری نادر اپنی تالیف " التصوف الاسلامی" صفحہ ۹۳ میں لکھتا ہے :-

" واسطی نے کہا کہ میں نے ابن سریج سے کہا کہ حلاج کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا وہ حافظِ قرآن تھا، اس کا عالم تھا، فقہ میں ماہر تھا۔ حدیث، اخبار اور سنن کا عالم تھا۔ صائم الدہر اور قائم اللیل تھا۔ جب وعظ کہتا تھا تو اس پر رقت طاری ہوجاتی تھی۔ میں اسے کافر نہیں سمجھتا۔"

قارئین غور کریں کہ حامد (وزیر خلیفہ) کہتا ہے کہ حلاج قطعاً جاہل تھا۔ ابن سریج کہتا ہے کہ وہ بہت بڑا عالم فاضل شخص تھا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ دونوں حلاج کے ہمعصر اور شناسا ہیں۔

(۵) ڈاکٹر زکی مبارک اپنی تالیف " التصوف الاسلامی" جلد اول صفحہ ۲۱۰ تا لکھتا ہے :-

" ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس سے قاری کو اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ صوفیوں اور شیعوں کے بعض عقائد و نظریات کی اصل نصرانیت ہے اور یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلاج اپنی اصل حقیقت فطرت میں شیعہ تھا اور وہ "حقیقت محمدیہ" کے بجائے "حقیقت علویہ" پر اعتقاد رکھتا تھا اور اس نے اپنے مریدوں میں سے ایک کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں اسم اللہ کو اس توضیح کے

ساتھ لکھا ہے کہ علی علیہ السلام بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ حلاج علی کو اللہ اور وجود کے درمیان "صلہ" یقین کرتا تھا (تاریخ بغداد جلد ہشتم صفحہ ۱۳۶)

خطیب بغدادی نے سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ہمارے پاس دینور سے ایک آدمی آیا اس کے پاس ایک تھیلا تھا جسے وہ شب و روز اپنے پاس سے جدا نہیں کرتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کے تھیلے کی تلاشی لی تو اس میں حلاج کا ایک خط نکلا جس کا عنوان یہ تھا " رحمٰن الرحیم کی طرف سے فلاں ابن فلاں کے نام" پس جب وہ خط حلاج کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا ہاں یہ خط میرا لکھا ہوا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا تو نبوت کا مدعی تو تھا ہی اب تو نے ربوبیت کا دعویٰ بھی کردیا؟ یہ سن کر حلاج نے کہا: میں نے ربوبیت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے نزدیک "عین الجمع" ہے اور اس لئے دراصل اس کا کاتب اللہ ہی ہے میں اور میرا ہاتھ دونوں بمنزلہ آلہ ہیں۔" (تاریخ بغداد جلد ۸ صفحہ ۱۲۸)

حلاج اپنے آپ کو من صُوَر علی رضؓ یا من صوَر محمدؐ سمجھتا تھا اور علی رضؓ یا محمدؐ تمام موجودات کے موجد ہیں۔ حلاج کے مرید یہ بھی کہتے تھے کہ جس طرح مسیح مصلوب نہیں ہوا بلکہ اس کی شبیہ دوسرے پر ڈال دی گئی اسی طرح حلاج بھی مصلوب نہیں ہوا۔ اِنَّہٗ لَمْ یُصْلَبْ وَ اِنَّمَا شُبِّہَ لَہُمْ صَلِیْبُہٗ (تاریخ بغداد صفحہ ۱۴۱)

حلاج نظریہ وحدۃ الوجود یا نظریہ حلول کا معتقد تھا جیسا کہ اس کے بعض اشعار سے واضح ہے :-

مُزِجَتْ روحک فی روحی کما تُمْزَجُ الخمرۃ بالماء الزلال

فاذا مسک شیءٌ مسّنی فاذا انت انا فی کل حال

اے محبوب! تیری روح میری روح میں اسی طرح ملا دی گئی ہے جس طرح شراب صاف پانی میں ملا دی جاتی ہے پس جب کوئی شے تجھے مس کرتی ہے تو گویا مجھے مس کرتی ہے پس ہر حال میں تو میں ہے (مقتبس از تصوف الاسلامی مؤلفہ ڈاکٹر زکی مبارک جلد اول صفحہ ۲۱۱ / ۲۱۲ مطبوعہ مصر ۱۹۵۴ء)

(۶) مشہور مؤرخ ابن اثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں " ماہ رمضان ۳۱۳ھ میں بغداد کے بابِ عامہ کے سامنے زنادقہ کی ۱۴۰۰ کتابیں جلائی گئیں۔ ان میں بعض کتابیں حلاج کی مصنفہ بھی تھیں۔ ان کتابوں سے بہت سا سونا ساقط ہوا جو ان پر چڑھا ہوا تھا اور اسی سال شاکر الزاہد بھی ظاہر ہوا جو حلاج کا ساتھی تھا اور بغداد کا باشندہ تھا۔ سلمی نے اپنی تاریخ طبقات الصوفیہ میں لکھا ہے کہ شاکر حلاج کا خادم تھا اور حلاج کی طرح اس پر بھی قرمطی ہونے کی تہمت لگی ہوئی تھی۔" (جلد ششم صفحہ ۱۷۶ مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ)

[1] تصوف کی اس اصطلاح کا مطلب ہے بندے کا خدا کی مشیت کے ساتھ کامل طور سے متحد ہوجانا (مؤلف)

(۷) الحماسۃ الصغریٰ صفحہ ۱۸۸ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۴ء میں حسب ذیل اشعار درج ہیں :-

تنسب ہذہ الابیات للحسین بن منصور الحلاج یقولہا فی مذہب الحلول :-

یا سرّ سرٍّ یدقّ حتی ۔۔۔ یجلّ عن وصف کلّ حیّ
و ظاہراً باطناً تبدّی ۔۔۔ من کلّ شیٍٔ لکلّ شیٍٔ
یا جملۃ الکل لست غیری ۔۔۔ فما اعتذاری اذن الیّ

ای انت یاربنا جملۃ العالم کلہ، و انا انت فلماذا اعتذر الی نفسی اذا اذنبت اذ انک نفسی

اے بھیدوں کے بھید کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ ہر زندہ شے کے بیان سے بالاتر ہے اور وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر شے سے ہر شے کے لئے ظاہر ہو رہا ہے۔ اے جملۃ الکل! تو میرا غیر نہیں ہے۔ پس میں کیسے خود اپنے ہی سے معذرت کروں؟

(۸) پروفیسر لوئی ماسینیوں نے "اخبار الحلاج" کو ایڈٹ کر کے ۱۹۳۶ء میں پیرس سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں حلاج کی سیرت سے متعلق جو حکایات اور روایات جمع کی گئی ہیں ان میں سے چند روایات و حکایات ذیل میں درج کرتا ہوں :-

(ا) ابراہیم ابن فاتک بیان کرتا ہے کہ جب حسین بن منصور کو مصلوب کرنے کے لئے لایا گیا۔ اور جب اس نے صلیب اور میخوں کو دیکھا تو اس شدت کے ساتھ ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر اس نے مجمع کی طرف نگاہ ڈالی تو شبلی کو دیکھ کر ان سے کہا اے ابوبکر کیا تمہارے پاس تمہارا سجادہ ہے؟ انہوں نے کہا "بلی یا شیخ"۔ یہ سن کر حلاج نے کہا "بچھا دو" پھر حلاج نے اس پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد یہ آیت پڑھی وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ الخ (۲ - ۱۵۵ و ۱۵۶) یعنی ہم ضرور کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو۔ جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اس کے بعد دوسری فاتحہ کے بعد یہ آیت پڑھی "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (۳ - ۱۸۵) یعنی ہر ایک شخص موت کو چکھنے والا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے پورے اجر دیئے جائیں گے۔ پس جو آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور اپنی مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو نری دھوکے کی پونجی ہے۔ جب حلاج نماز سے فارغ ہوا تو اس نے دعا مانگی جس کے حسب ذیل الفاظ

مجھے یاد رہ گئے ہیں "اے اللہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو مجھے اس فضل و کرم کا شکر ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے جو تو نے میرے حال زار پر کیا ہے اور وہ کرم یہ ہے کہ تو نے مجھے اپنے تابناک چہرے کی وہ تجلی دکھائی ہے جسے تو نے دوسروں پر ظاہر نہیں کیا۔ اے اللہ! یہ تیرے بندے ہیں جو مجھے تیرے دین کی حمایت میں قتل کرنے آئے ہیں اور مجھے قتل کر کے تیری خوشنودی حاصل کرنی چاہتے ہیں تو ان کو معاف کر دے اور ان پر رحم کر۔ فانک و کشفت لہم ما کشفت لی لما فعلوا ما فعلوا و لو سترت عنی ما سترت عنہم لما ابتلیت بما ابتلیت فلک الحمد فیما تفعل و لک الحمد فیما ترید۔ کیونکہ اگر تو ان پر وہ حقیقت ظاہر کر دیتا جو تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے تو یہ لوگ وہ کام نہ کرتے جو کر رہے ہیں اور اگر تو مجھ سے وہ پوشیدہ رکھتا جو بات ان سے پوشیدہ رکھی ہے تو میں اس بلا (آزمائش) میں مبتلا نہ ہوتا۔ بس تیرے لئے حمد ہے جو تو کرتا ہے اور تیرے لئے حمد ہے جو تو ارادہ کرتا ہے"۔ دعا مانگنے کے بعد وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور دل ہی دل میں اپنے خدا سے مناجات کرتا رہا یہاں تک کہ جلاد (ابو الحارث) کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے حلاج کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر شبلیؒ نے نعرہ کیا اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ابو الحسین الواسطی اور دوسرے صوفیا کا بھی یہی حال ہو گیا۔ لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ قریب تھا کہ فتنہ برپا ہو جاتا اس لئے محافظوں نے حلاج کو فوراً مصلوب کر دیا"۔

(ب) ابراہیم ابن فاتک بیان کرتا ہے کہ میں ایک دن حلاج کے گھر میں داخل ہوا وہ میری آمد سے بے خبر تھا۔ میں نے اسے دیکھا کہ وہ سر کے بل کھڑا ہے اور خدا سے کہہ رہا ہے اے وہ ذات جو پیوست ہے میرے دل میں قرب کے لحاظ سے اور دور ہے مجھ سے جیسے دور ہونا قدیم کا حادث سے ہے بلحاظ غیوبیت تو منکشف ہوتا ہے مجھ پر۔ جلوہ دکھا مجھ کو یہاں تک کہ میں تجھے الکل سمجھنے لگتا ہوں اور تو دور کیا جاتا ہے مجھ سے یہاں تک کہ میں تیری نفی کرنے لگتا ہوں تو اس صورت میں نہ تیرا بُعد باقی رہتا ہے اور نہ تیرا قرب نفع دیتا ہے اور نہ تیری حرب مجھے نفع دیتی ہے اور نہ تیری صلح مجھے امن کرتی ہے۔ جب اسے میری آہٹ محسوس ہوئی تو اٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا اندر آ جاؤ۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں انگارے کی مانند دہک رہی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگا "اے بیٹے! بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں ولی اللہ ہوں اور بعض لوگ گواہی دیتے ہیں کہ میں کافر ہوں۔ جو لوگ مجھے کافر کہتے ہیں وہ مجھے اور خدا کو ان لوگوں سے عزیز تر ہیں جو مجھے ولی کہتے ہیں"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے جواب

دیا، جو لوگ مجھے ولی سمجھتے ہیں وہ میرے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں۔ لیکن جو مجھے کافر سمجھتے ہیں وہ تعصب دینی کی بنا پر ایسا سمجھتے ہیں اور جس نے دین میں تعصب کیا وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہے جس نے کسی کے متعلق حسن ظن سے کام لیا اور اے ابراہیم تیرا کیا حال ہوگا جب تو مجھے مصلوب ہوتے، قتل ہوتے اور آگ میں جلائے جاتے دیکھے گا؟ بے شک وہ دن میری تمام عمر کے ایام میں اسعد ہوگا۔ اس کے بعد کہا۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ فی امان اللہ۔"

(ج) احمد ابن ابی الفتح بن عاصم البیضاوی نے کہا کہ میں نے حلاج کو اپنے شاگردوں کو یہ لکھواتے سنا کہ بے شک اللہ ذات واحد ہے۔ قائم بنفسہٖ ہے۔ اپنے قدم کی وجہ سے اپنے غیر سے منفرد ہے اور اپنی ربوبیت کی وجہ سے اپنے ماسوا سے متوحد ہے۔ کوئی شے اس سے ممازج (گھل مل کر ایک) نہیں ہو سکتی۔ اور غیر اس سے مخالط (شیر و شکر) نہیں ہو سکتا۔ مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور زمان اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ فکر انسانی اس کا اندازہ نہیں کر سکتی اور تصور انسانی اس کی صورت نہیں بنا سکتا اور نگاہ اسے دیکھ پا نہیں سکتی اور خطرہ اس کا خیال نہیں کر سکتا۔

(د) ابو اسحٰق ابراہیم بن عبد الکریم حلوانی نے کہا کہ میں نے دس سال تک حلاج کی خدمت کی اور لوگوں کے مقابلے میں اس سے بہت زیادہ قریب رہا۔ ایک دن میں نے سوچا کہ بعض لوگ اسے زندیق کہتے ہیں تو میں نے اپنے دل میں کہا لاؤ اس کا امتحان تو کروں۔ پس میں نے ایک دن اس سے کہا یا شیخ! میں چاہتا ہوں کہ میں باطنی مذہب کا کچھ علم حاصل کروں (میں نے مذہب الباطن کہا تھا) یہ سن کر اس نے پوچھا تم باطل کے باطن سے آگاہ ہونا چاہتے ہو یا حق کے باطن سے؟ پھر کہا حق کا باطن یہ ہے کہ اس کا ظاہر شریعت ہے اور جو شخص اتباع شریعت کرے گا اس پر حق کا باطن خود بخود منکشف ہو جائے گا اور حق کا باطن المعرفۃ باللہ ہے۔ اب رہا باطن الباطل تو باطل کا باطن اس کے ظاہر سے اقبح ہے اور اس کا ظاہر اس کے باطن سے اشنع ہے پس تو اس میں مشغول نہ ہونا اور میرا حال یہ ہے کہ میں نے کبھی فرض نماز نہیں پڑھی جب تک وضو سے پہلے غسل نہ کیا ہو۔ اب میں ستر سالہ ہوں اور میں نے پچاس سال میں دو سو سال کی نمازیں پڑھ لی ہیں۔

(ہ) ابو الحسن حلوانی نے کہا میں نے دیکھا کہ حلاج بیڑیاں پہنے ہوئے اکڑتا ہوا سولی کی طرف آ رہا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

میرا دوست مطلقاً ظلم کی طرف منسوب نہیں ہے۔ مجھے بلایا اور مجھے خوش آمدید کہا جیسے میزبان مہمان کو خوش آمدید کہتا ہے۔ جب جام شراب گردش میں آیا تو اس نے تلوار اور نطع منگایا۔ یہ نتیجہ

ہوتا ہے اس شخص کا جو موسم بہار میں اژدہے کے ساتھ شراب پیتا ہے۔

(و) ابو بکر شبلی رح سے روایت ہے کہ جب حلاج کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تو میں اسے دیکھنے گیا۔ وہ اس وقت صلیب پر لٹک رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تصوف کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ اس کا زیریں مرتبہ ہے۔" میں نے پوچھا "اس کا اعلیٰ مرتبہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا تو اسے سمجھ نہیں سکتا مگر کل یہاں آ کر دیکھ لینا۔ جو میں نے دیکھا ہے وہ تیری نگاہ سے غائب ہے۔ جب عشا کا وقت ہوا تو خلیفہ کا حکم آیا کہ اس کی گردن مار دی جائے۔ محافظوں نے کہا اب تو رات ہو گئی ہے کل صبح ماریں گے پس جب صبح ہوئی تو اسے صلیب سے اتارا گیا اور جائے قتل کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت اس نے باواز بلند کہا "حسب الواجد افراد الواحد لہ" پانے والے کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ الواحد اس کے لئے تنہا رہ جائے اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی :-

یستعجل بھا الذین لا یؤمنون بھا والذین آمنوا مشفقون منھا و یعلمون انھا الحق

یہ آخری بات تھی جو اس کے منہ سے سنی گئی اس کے بعد اس کی گردن ماری گئی پھر اس کی نعش کو ٹاٹ میں لپیٹا گیا۔ اس پر نفط (پیٹرول) ڈالا گیا اور اسے جلایا گیا۔ پھر اس کی راکھ ایک مینار پر چڑھ کر ہوا میں اڑا دی گئی۔

(ز) احمد ابن فاتک نے کہا کہ حلاج نے مجھ سے کہا کہ جس نے یہ گمان کیا کہ الوہیت بشریت کے ساتھ یا بشریت الوہیت کے ساتھ ممزوج ہو سکتی ہے تو اس نے کلمہ کفر کہا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے خلق کی ذوات اور صفات سے منفرد ہے۔ کسی وجہ سے بھی اللہ کی ذات اور خلق کی ذوات میں مشابہت نہیں ہے اور قدیم اور محدث میں مشابہت ہو بھی کیسے؟ اور جس نے یہ غلط خیال کیا کہ باری تعالیٰ کسی مکان میں ہے یا کسی مکان سے متصل ہے یا کسی مکان کے اوپر ہے یا کسی ضمیر (قلب) میں متصور ہو سکتا ہے یا اوہام میں متخیل ہو سکتا ہے یا کسی نعت یا صفت کے تحت داخل ہو سکتا ہے تو وہ مشرک ہے۔

(ح) احمد ابن فاتک نے کہا کہ جب حلاج کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تو اس نے کہا اے خدا میں دار الرغائب میں رہا تاکہ عجائبات دیکھوں۔ اے اللہ تو اس سے بھی محبت کرتا ہے جو تجھے ایذا دیتا ہے تو اس سے کیسے محبت نہ کرے گا جسے تیری وجہ سے ایذا دی گئی۔"

(ط) ابو نصر احمد بن سعید الاسبیجانی نے کہا کہ میں نے حلاج کو یہ کہتے سنا کہ "فوق اللہ تعالیٰ پر سایہ نہیں کرتا اور تحت اسے سہارا نہیں دے سکتا۔ حد اس کے مقابل نہیں، عند اس کا مزاحم نہیں۔ خلف (پس)

اسے اخذ نہیں کر سکتا، امام (پیش) اسے محدود نہیں کر سکتا، قبل اسے مدد نہیں دے سکتا، بعد اسے فوت نہیں کر سکتا۔ کل اسے جمع نہیں کر سکتا۔ کان اسے پا نہیں سکتا، لیس اسے گم نہیں کر سکتا۔ اس کا وصف یہی ہے کہ اس کا وصف بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کے فعل کی کوئی علت نہیں، اس کی ہستی کی کوئی انتہا نہیں، وہ خلق کے احوال سے منزہ ہے، خلق اس سے پیوست نہیں ہو سکتی۔ اس کے فعل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ مخلوقات سے اپنے قدم کے اعتبار سے جدا ہے اور مخلوقات اپنے حدوث کے اعتبار سے اس سے جدا ہیں۔ اگر تو کہے متیٰ (کب) تو اس کا وجود وقت پر سابق ہے اور اگر تو کہے "ھو" تو ہا اور واؤ اسی کی مخلوق ہیں اور اگر تو کہے این (کہاں) تو اس کا وجود مکان پر مقدم ہے۔ اس کی معرفت اس کی توحید ہے اور اس کی توحید، خلق سے اس کی تمیز ہے۔ جو کچھ اوہام انسانی میں متصور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے خلاف ہے۔ جو اس سے پیدا ہوا ہے وہ کیسے اس کے ساتھ حال بن سکتا ہے؟ اور جسے اس نے پیدا کیا ہے وہ کیسے اس تک جا سکتا ہے؟ آنکھیں اس کا نظارہ نہیں کر سکتیں اور اوہام و ظنون اس کا تقابل نہیں کر سکتے۔ اس کا قرب اس کی کرامت ہے اور اس کا بعد اس کی اہانت ہے۔ اس کا علو توقل کے بغیر ہے اور اس کی آمد بغیر تنقل ہے (کیونکہ) وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔

(ی) ایک دن شبلی رح حلاج کے پاس گئے اور کہا یا شیخ! اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ کیسا ہے (اس کی کیفیت کیا ہے؟) جواب دیا یہ راستہ دو قدموں کا ہے۔ تم صرف دو قدم چل کر اس تک پہنچ سکتے ہو۔ پہلا قدم یہ ہے کہ دنیا کو اس کے عاشقوں کے منہ پر مار دو (دنیا سے قطع نظر کرو) اور دوسرا قدم یہ ہے کہ آخرت کو اس کے چاہنے والوں کے حوالے کر دو (آخرت سے بے نیاز ہو جاؤ)

انوارِ مجددی

یعنی حضرت مجدد الف ثانی رح کے چیدہ چیدہ مکتوبات کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۸۴ مجلد مع ڈسٹ کور۔ قیمت چار روپے صرف (محصول ڈاک علاوہ)

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، کرشن نگر، لاہور : فون ۶۹۵۲۲

پروفیسر محمد منور

کلامِ اکبر کا سیاسی و تہذیبی پس منظر

بہ سلسلہ تقریظ شرح "تلمیحات و شرح مشکلاتِ اکبر"

ان سطور کی تقریب وہ کتاب ہے جو "شرح تلمیحات و شرح مشکلات اکبر" کے نام سے محترمی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے حال ہی میں تالیف و تصنیف فرمائی ہے۔ پروفیسر صاحب محتاج تعارف نہیں انہوں نے علم، سیاست اور ادب کی جو خدمت کی ہے وہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

لیکن موجودہ دور میں انہیں زیادہ تر مقبولیت اور شہرت حضرت علامہ اقبال کے شارح کی حیثیت سے حاصل ہے۔ بعض اوقات مقبولیت کے ظاہری اسباب اصل حیثیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ خیام کی رباعیات ہوں خواہ خواجہ میر درد کی غزل۔ یہی عالم چشتی صاحب کا رہا۔ ان کی وسعتِ مطالعہ کی کچھ جھلکیاں تو "شرحوں" میں نظر آ جاتی ہیں لیکن انہوں نے جن مختلف موضوعات علم اور شعبہ ہائے ادب کے حصول میں جان کھپائی ہے اس کا پوری طرح احساس نہیں ہو سکتا۔ "قرآن، تصوف، شریعت، کلام" کے علاوہ تاریخ اور فلسفہ مشرق و مغرب، فارسی، اردو، عربی اور انگریزی زبان و ادب، قدیم و جدید بین الاقوامی فکری تحریکیں اور۔ یہ اور وہ سب ان کی جولانگاہ نظر ہے۔ اور پھر مصیبت یہ ہے کہ جس موضوع کی طرف بھی رخ کیا ہے اس کے جزئیے کو کھنگال ڈالا ہے۔ پڑھا بہت زیادہ، غور و فکر بھی خاصہ کیا، لکھا بھی بہت کچھ۔ لیکن جتنا پڑھا اور سوچا، اتنا لکھا نہیں اور جتنا لکھا اتنا چھپوایا نہیں۔ بعض مسودے مکمل پڑے ہیں بعض نامکمل، بعض خاکے ہیں گویا تشنۂ طباعت تحریروں کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ نیم سرکاری اور غیر سرکاری ناشرین کے انداز اپنے ہیں اور پروفیسر صاحب کی وضع اپنی۔ وہ "با زمانہ بساز" کے بجائے "با زمانہ ستیز" کے زیادہ قائل ہیں۔ نہ طبع زمانہ بدلے اور نہ یہ رعایت فرمائیں۔ محرومی قوم کی۔

الحمد للہ کہ انہوں نے حضرت اکبر الہ آبادی کی طرف بھی بغرض شرح توجہ فرمائی۔ پروفیسر صاحب کی خوش قسمتی کہ انہیں حضرت اکبر کی زیارت بھی میسر ہوئی۔ لہٰذا ان کی باتیں خود انہی کی زبانی سنیں۔ انہیں حضرت اکبر کے

ساتھ قربِ موطن کا شرف بھی حاصل تھا۔ یوپی اور خصوصاً الہ آباد کے گرد و نواح سے متعلق بہت سے ان امور و واقعات سے پروفیسر صاحب آگاہ ہیں جن کی طرف حضرت اکبر نے اشارہ کیا ہے۔

حضرت اکبر کی بدقسمتی کہ ان کی عظمت، دقتِ نظر اور ذکاوتِ حس پر ان کی مزاح نگاری نے پردہ ڈال دیا۔ لہٰذا ان کے نہاں خانۂ دل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش بہت کم اہلِ نظر نے فرمائی۔ بقول غالب

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل!

حضرت اکبر جس دور سے گزرے وہ ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ و ہندیہ کے لئے ایک عبرت ناک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب انگڑائی لے کر دعوائے بیداری کر رہا تھا اور مشرق جماہی لے کر استقبالِ خواب میں مصروف تھا۔ خصوصاً برعظیم پاک و ہند کے مسلمان ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک جانب اپنے تسلط کی بربادی کا منظر تازہ جگر چبا رہا تھا، دوسری طرف ابنائے وطن کے منتقمانہ رویے کا سدباب کرتے ہوئے ان کے ساتھ نباہ کرنا تھا۔ تیسری طرف انگریزوں کی تازہ وارد سیادت سے نپٹنا تھا۔

انگریزوں کو جہاں آغازِ کار میں مسلمان غدار فرداً فرداً ملے، وہاں ہندو قوم کی اکثریت نے ان کا ساتھ دیا اور انگریز نے ہندوؤں کے تعاون کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تاکہ مسلمانوں کی رگِ گردن کو جس میں حکومت کے نشے نے رعونت بھر دی تھی اور جن کو اسلام کی برتری پر ناز تھا کچل دیا جائے۔ گویا مسلمان چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے تھے ——— بدلتی ہوئی زندگی کی عام دوڑ میں وہ یوں بھی پیچھے رہ گئے کہ اپنی حکومت کے دور میں انہوں نے حرفت و تجارت کو منہ نہ لگایا۔ صدہا سال تک فوجی اور انتظامی عہدے ہی سنبھالے تھے اور جاگیرداری اور زمینداری سے شغل فرمایا تھا۔ جب حکومت نہ رہی تو عہدے بھی گئے اور جاگیریں بھی۔ مفلوک الحالی اور غلامی نے بیک وقت آن لیا۔

ہندوؤں کے دل پر اس انقلاب کا کوئی داغ نہ تھا۔ ان کی اکثریت ایک آقا کی ملازمت کے بجائے دوسرے آقا کی ملازمت میں مگن ہو گئی اور پھر سر پھروں کو چھوڑ کر حسبِ دستورِ غلامی پچھلے آقا کی شکایت اور مخالفت کرنے لگی۔ خاص طور پر بنگال کے ہندوؤں نے انگریزی سیادت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہر شعبے پر چھا گئے۔ پھر جوں جوں انگریزی سیادت پھیلتی گئی بنگالی "بابو" بھی پھیلتا چلا گیا۔ مسٹر بوس، گھوش، دت اور مکرجی، بینرجی، چیٹرجی بھی انگریز کے ساتھ ساتھ بنگال سے نکل کر براستہ بہار اور یوپی لاہور اور پشاور تک پہنچ گئے ——— غرضیکہ زوال کے احساس کو شدت کے ساتھ مسلمانوں ہی سے دل کا داغ بنا تھا اور بنا بقول حضرت اکبر ؎

بہار ہی سے نہیں جو واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ جانیں
یہ داغ تو ہیں انہی کے دل پر جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا نتیجہ مسلمانانِ برصغیر کے لئے بے حد وجوہ تباہ کن تھا۔ دہلی کی برائے نام اور علامتی شہنشاہی کا چراغ گل ہو گیا۔ وہ برائے نام سلطنت بھی مسلمانوں کی نفسیاتی چہار دیواری تھی۔ اس کے انہدام کا پیدا کردہ دوہرا ناکامی ہی کیا کم تھا کہ ساتھ ہی انگریز نے انہیں اپنی آتشِ انتقام میں بھسم کرنا شروع کر دیا۔ ہندو بھی بغاوت میں مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے مگر وہ گنگا میں اشنان کر کے "پوتر" ہو گئے۔ ان کی بغاوت کو انگریزوں نے محض بدتمیزی جانا اور مسلمانوں کی بغاوت کو حق مانا۔ چنانچہ جہاں ہندوؤں کو انفرادی سزا ملی وہاں مسلمانوں کو اجتماعی تعزیر کا ہدف بننا پڑا۔ انگریز کا مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب تاریخی روح کا مالک تھا جیسا کہ حضرت اکبر نے وضاحت کی تھی ؎

کلیسا کے مقابل آج مشکل میرا جینا ہے
کہ غیروں پہ اسے غصہ ہی ہے اور مجھ پہ کینا ہے

جب مسلمان بے آسرا ہو گئے اور یہی نہیں بلکہ حکومت انگلشیہ کی انتقامی کارروائیوں کا ہدف قرار پا گئے تو اہلِ درد میں سے بعض نے ہجرت کا پروگرام بنایا۔ بعض نے عداوت و مقاومت کو جاری رکھنے کا اور بعض نے سرِ تسلیم خم کر دینے کا۔ عافیت آخری صورت میں تھی۔ لہٰذا اس آواز کو نسبتاً زیادہ معاون مل گئے۔ اہلِ تسلیم کے سرخیل سرسید تھے۔ ان کی مخلصانہ رائے یہ تھی کہ انگریزوں کو راضی رکھا جائے اور نئی تعلیم سے مسلح ہو کر نئی زندگی کا آغاز کیا جائے۔ ورنہ غار ہائے فنا منہ کھولے کھڑے ہیں۔ مگر انگریز کو راضی رکھنے کا تصور تسلیم سے بڑھ کر اندھی تقلید بننے لگا۔ نئی تعلیم کے ساتھ مذہب بیزاری اور الحاد بھی در آیا۔ بقول علامہ اقبال: شیریں کے جلو میں تیشۂ فرہاد بھی تشریف لے آیا ——— یہ پریشان کن بات حضرت اکبر کے لئے بلکہ ہر صاحبِ نظر کے لئے اضطراب انگیز تھی۔ اکبر بھی جانتے تھے کہ نئی تعلیم کے بغیر چارہ کار نہیں مگر ڈرتے بھی تھے کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں گے چنانچہ اس کشمکش میں الجھ کر رہ جاتے تھے۔ یہ الجھن تلخی بھی پیدا کرتی تھی اور مایوسی بھی۔ ردِعمل کے طور پر ظرافت، طنز اور مزاح جنم لیتا تھا۔ چنانچہ وہ انگریز پر بھی غصہ نکالتے تھے اور سرسید پر بھی۔ یہی عالم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا ہے بلکہ وہ تو سید پر حضرت اکبر سے بھی کچھ بڑھ کر ہی غصہ نکالتے ہیں۔

حضرت اکبر دیکھ رہے تھے کہ مسلمان بازی ہار چکے ہیں۔ وہ جان چکے تھے کہ قدیم اخلاقی اور معاشرتی دیواریں قدیم سہاروں پر قائم نہ رہ سکیں گی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا واویلا صدا بصحرا ہے۔ مگر وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ فریاد بہرحال فرض ہے۔ کم از کم یہ امر "ریکارڈ" میں تو رہے کہ انہوں نے حسبِ مقدور احتجاج کیا تھا ؎

نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

نئی تعلیمی پالیسی کا مذہبی اعتبار سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ خود سرسید کے لئے بھی دل شکن تھا۔ ان کے آخری زمانے کے خطبات اس امر پر شاہد ہیں۔ جالندھر اور لدھیانہ میں انہوں نے مسلمان نوجوانوں کے سپاس ناموں کا جس انداز میں جواب پیش کیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ "تم ترقی یافتہ قوم بنو مگر مسلمان رہ کر۔ اگر تم مسلمان نہ رہے تو قوم کا کیا مطلب؟" ——— اکبر بھی جانتے تھے کہ سرسید کا مقصد کیا تھا اور نتیجہ کیا نکلا اور اس نتیجے نے سرسید کو کتنی اذیت دی تھی۔

ے زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو گورِ سیّد پہ جل رہی ہے

حضرت اکبرؔ نئی روشنی سے بدظن تھے۔ ان کے نزدیک نئی تہذیب کی روح مادہ پرستی اور دہریت تھی۔ وہ مزاجاً کٹر مذہبی آدمی تھے۔ چنانچہ نباہ کیسے ہوتا۔ وہ تادمِ آخر فریاد اور احتجاج کرتے رہے۔ وہ انگریز کے ملازم تھے۔ اور بہت بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے باوصف جو کچھ کہنا چاہا کہا۔ اشاروں میں کہا، کنایوں میں کہا۔ لیکن وہ اشارے فصیح و بلیغ تھے اور پھر حکومت بھی کند ذہن نہ تھی اور نہ حکومت کو سمجھانے والے گونگے تھے۔ اس اعتبار سے اکبرؔ کا موقف ایک مسلسل جہاد تھا اور وہ ہماری ملت کے لئے بجا طور پر "ہیرو" کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر حضرت علامہ اور دیگر اکابرِ ملت انہیں اپنا پیر و مرشد مانتے تھے تو یہ بالکل بجا امر تھا۔

حضرت اکبرؔ کی ساری داستانِ اضطراب آج کی پود کے لئے واضح نہیں۔ اس لئے کہ بہت سے انفرادی واقعات کتبِ تاریخ کا جزو نہ بنے اور اگر بنے تو عوام تک نہ پہنچے۔ ان واقعات پر روشنی ڈالے بغیر حضرت اکبرؔ کے درجنوں کیا سیکڑوں اشعار سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اسی طرح کئی اشخاص اور ادارے ایسے ہیں جو ان کے دور میں معروف تھے اور اب گلدستۂ طاقِ نسیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ "علائم و رموز" اس کے علاوہ ہیں۔ چنانچہ پانیر، بشیر، البشیر، رجبن، جمن، کالا کوا، بابو، گلٹ، اونٹ، سوسن، ناگ پھنی، پیرِ مغاں، پیرلنڈن، مرشد، اشتوتش، میاں، ماہی مراتب، ڈاسن، گنگا، بھوے وغیرہ کلمات تشریح طلب تھے۔ پروفیسر لویت سلیم چشتی صاحب نے بڑی خوبی سے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔

ان سیاسی امور کے علاوہ اکبرؔ کے یہاں متصوفانہ، متفکرانہ اور فلسفیانہ مضامین کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ قدیم صوفیوں اور فلسفیوں سے بھی آگاہ تھے اور اپنے معاصرین سے بھی باخبر تھے۔ گویا ارسطو اور افلاطون اور غزالی و رومی کے ساتھ ساتھ مل اور سپنسر (SPENSER) بھی جلوہ افروز ہیں۔ شعر میں افکار و نظریات کا عکس پہنچتا ہے، صریح استدلال ساتھ نہیں آتا۔ بحث تعاون نہیں کرتی۔ اس لئے سادہ قاری کے لئے اور بقول چشتی صاحب ایک خالص "ایم اے اردو" کے لئے اس کا سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے ——— اس مشکل سے اس دور "دانش وری" میں چشتی صاحب ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور خوب ہوئے ——— ایک بات ضرور توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ "حکایت لذیذ بود لہذا" چشتی صاحب نے "دراز تر" کر دی۔ یعنی بعض ایسے اشعار بھی شاملِ کتاب کر دیئے جن کی تشریح کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ البتہ وہ اشعار معنوی خوبی، حسنِ بیان، خوبیٔ محاورہ، جدتِ تشبیہہ یا ندرتِ قافیہ کے باعث خوشگوار ضرور ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب شرح کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا انتخاب بھی بن گئی ہے اور زیادہ مفید ہو گئی ہے ——— بتوفیقِ ایزدی چشتی صاحب سے ایک بہت بڑی خدمت انجام پا گئی ہے۔ کتاب کا

مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ چشتی صاحب کو دورِ معاصر کے اہلِ علم و دانش سے شدید شکایت ہے اور اس شکایت کا لہجہ اکبرؔ کے لہجے سے زیادہ تلخ اور گمبھیر ہے ——— گویا وہ اشعارِ اکبرؔ کی تشریح کے ساتھ ساتھ تازیانۂ توبیخ بھی لگائے چلے گئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ ایک نہایت عالم مگر نہایت سخت گیر معلم سے تحصیل کرنا پڑ گئی ہے۔

کتاب کا کاغذ، کتابت، طباعت وغیرہ خاصی گوارا ہے۔ اکیس سطروں کے تقریباً چار سو صفحات ہیں۔ قیمت نو روپے ہے اور عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

دینی، علمی اور ادبی افق پر ایک نئے ستارے کا طلوع

ماہنامہ

ترجمان الحدیث لاہور

زیرِ ادارت: احسان الٰہی ظہیر ایم اے

پہلا شمارہ یکم نومبر سے منظرِ عام پر آ چکا ہے

شمارہ اوّل کے شرکاء

امام المحققین مولانا حافظ محمد گوندلوی
مولانا محمد عبدہ شیخ الحدیث
مولانا عبدالصمد صارم الازہری
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
ڈاکٹر احسان الٰہی رانا
پروفیسر عبدالقیوم
مولانا نعیم صدیقی
پروفیسر غلام احمد حریری
پروفیسر ساجد میر

شمارہ اوّل کے مشمولات

دوامِ حدیث
جمع و تدوینِ قرآن اور مصاحفِ عثمانؓ
تحریراتِ عہدِ رسالت
حدیث کے ماحول میں
سیرۃ ابن ہشام کا قدیم ترین نسخہ
تحریکِ اہلحدیث: ایک جائزہ
سوشلزم
چمن ملت کی شیرازہ بندی
الشان کامل

اور دوسرے مضامین

طباعت: آفسٹ، سفید کاغذ: صفحات ۶۴، فی پرچہ ۷۵ پیسے سالانہ ۸ روپے

دفتر ترجمان الحدیث، ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

لیحق الحق و یبطل الباطل

تاکہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل

اسلامی تحقیق کا مفہوم مُدّعا اور طریق کار

تالیف : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

قیمت قسم اعلیٰ : ڈیڑھ روپیہ ۔ وقسم ادنیٰ : ایک روپیہ (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

★

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

تالیف : اسرار احمد

★ فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء ★ بنیادی نقطہ نظر ★ عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش ★ مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل ★ علوم عمرانی کا ارتقاء ★ اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں ★ تعبیر کی کوتاہی ★ احیائے اسلام کی شرط لازم : تجدید ایمان ★ کرنے کا اصل کام ★ عملی اقدامات مع

"فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم : یوسف سلیم چشتی

سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸ صفحات ۵۶ ، طباعت آفسٹ ، قیمت : ایک روپیہ

شائع کردہ

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۲ فون ۶۹۵۲۲

جلد ۱۶ صفحہ ۶۹۴

تقریظ و تنقید

مقالات شام ہمدرد

مرتب : حکیم محمد سعید دہلوی ۔ صفحات : ۲۹۰

قیمت غیر مجلد نیوز پرنٹ : سات روپے پچیس پیسے ۔

ناشر : مکتبہ جدید نمبر ۴ شاہراہ فاطمہ جناح لاہور ۔

ہمدرد ٹرسٹ کے حکیم محمد سعید صاحب ایک عرصہ سے پاکستان کے مرکزی شہروں میں ”شام ہمدرد“ کے نام سے ایک مجلس منعقد کر رہے ہیں جس میں ملک کی نامور اور سربرآوردہ شخصیتوں کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے ۔ یہ مجالس مناسب وقفوں کے ساتھ منعقد کی جاتی ہیں اور چونکہ ان کے موضوعات عموماً بہت متنوع اور فکری و نظری اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے ملک کے دانش ور طبقہ میں ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے ۔ زیر نظر تصنیف شام ہمدرد میں سن ۱۹۶۳/۶۴ء کے دوران کی گئی تقاریر کا مجموعہ ہے ۔

اس مجموعہ میں بیس مقالات ہیں جن میں پانچ طب و سائنس سے ، چھ ادب و فلسفہ سے ، چار دین و مذہب سے اور پانچ قومی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے کتنے رنگ رنگ کے پھولوں سے یہ گلدستہ ترتیب دیا ہے ۔ علم و فن کے تمام اہم پہلو اس مختصر مجموعہ میں زیر بحث آ چکے ہیں ۔ ممتاز قانون دان اے کے بروہی صاحب نے کتاب پر تقریظ لکھی ہے ۔

مقررین جن کی تحریریں اس کتاب کی زینت ہیں ملک کی نہایت معتدد شخصیتیں ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اپنے فکر و فن کے نقوش ثبت کئے ہیں ۔ ان کی فہرست میں ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی جیسے سائنس دان ، جسٹس ایس اے رحمٰن جیسے ماہر قانون ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے ماہر تعلیم ، مفتی محمد شفیع اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے علما اور ایم اسلم اور صلاح الدین احمد جیسے ادیبوں کے نام ملتے ہیں ۔ ان لوگوں کے نام ہی اس بات کی ضمانت ہیں کہ ان کے خطبات مقصدی اور علم و فن کی راہوں میں نئے سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے ہوں گے ۔

جلد ۱۶ صفحہ ۶۹۵

تمام مقالات کے آغاز میں حکیم صاحب کے قلم سے مقرر کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ یہ بذات خود ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مقالات خواہ وہ فلسفہ و ادب سے تعلق رکھتے ہیں یا طب و سائنس سے اور ان کا محور دین ہے یا قوم، تمام تر غور و فکر اور تحقیق و تجزیہ پر مبنی ہیں۔ تاہم ان میں چند مقالات نہایت فکر انگیز اور دعوت عمل دینے والے ہیں۔ مثلاً اے کے بروہی صاحب کا مقالہ "دورِ حاضر کی رفتارِ تاریخ" مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا مقالہ "اختلافِ امت پر ایک نظر اور مسلمانوں کے لئے راہِ عمل" مولانا امین احسن اصلاحی کا مقالہ "پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل اور ہماری ذمہ داری" اور چودھری نذیر احمد خاں کا مقالہ "دولت مشترکہ ممالک اسلامیہ کے قیام کا امکان" یہ سب مقالات قوم کے لئے اپنے اندر ایک پیغام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے اپنے مقالہ "سائنس اور بقائے انسانی" میں سائنس کے حق میں جو وکالت کی ہے اس کے زور میں وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جن سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے۔ مثلاً یہ کہ "سائنس روحِ انسانی کی معراج ہے" "صرف مذہب ہماری نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتا" علاوہ ازیں مقالہ کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کے جس اقتباس کا حوالہ دیا ہے ہمیں اس کا سراغ نہیں مل سکا۔

فاضل مرتب نے کتاب کے آغاز میں "کلماتِ ابتدائیہ" میں یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کی ایک کوشش ہے اور شام ہمدرد کے مقررین وہ لوگ ہیں جو روایات اسلامی کے تحفظ کو مقصد زندگی بنائے ہوئے ہیں۔ فاضل مرتب کے اس بیان کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو کتاب اس مقصد پر پوری نہیں اترتی۔ کیا غزل ایک فطری صنفِ سخن ہے؟ ایک ادبی کاوش تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا بیان کردہ مقصد سے کیا تعلق! پھر جوش ملیح آبادی کون سی اسلامی روایات کے حامل ہیں؟

بحیثیت مجموعی کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ فکر و عمل کو بھی اس سے رہنمائی ملتی ہے۔ پھر ملک کی نامور شخصیتوں کے خیالات و افکار میں جھانکنے کا موقع جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے، وہ اس کے مطالعہ کا ایک زائد حاصل ہے۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب آئندہ بھی شام ہمدرد کے مقالات کو چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

کتاب کی کتابت و طباعت معیاری ہے۔ ہر مقالہ کے مصنف کی تصاویر بھی اس میں لگائی گئی ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پہلوؤں سے کتاب کو کامیاب بنانے پر جو محنت صرف کی گئی ہے اس کا عشر عشیر بھی قرآن مجید کی ان آیات کی تصحیح پر صرف نہیں کیا گیا جو مقالات میں آئی ہیں ان میں جابجا کتابت اور اعراب کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

قیمت ہماری رائے میں قدرے زیادہ مقرر کی گئی ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ غریب تو کیا متوسط طبقہ کے عوام بھی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ ایک مقصدی تصنیف کو جیسا کہ فاضل مرتب کا کتاب کے بارے میں دعویٰ ہے اتنا گراں نہیں ہونا چاہیئے۔ (خ۔ م)

عادلانہ دفاع

مصنفہ سید نور الحسن صاحب بخاری : حصہ اول سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ۲۲۴ صفحات۔ حصہ دوم سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ ۲۱۸ صفحات : غیر مجلد

قیمت حصہ اوّل تین روپے۔ حصہ دوم چھ روپے : شائع کردہ : محمود الحسن نور محمد تاجر کتب ۱۷/۲ شاہ عالم مارکٹ لاہور

اس کتاب میں جیسا کہ ٹائٹل پیج کی عبارت سے واضح ہے۔ بخاری صاحب نے اصحاب رسول پر مودودی صاحب کے ان بے رکانہ اور جارحانہ حملوں کا مفصل، مدلل اور مسکت دفاع کیا ہے جو انہوں نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب "خلافت اور ملوکیت" میں امام مظلوم سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضہ اور دیگر اکابر صحابہ کرام پر کئے ہیں۔

مودودی صاحب نے اپنی اس کتاب میں غلط موضوع اور ضعیف روایات کا سہارا لے کر حضرت عثمان رضہ اور دیگر صحابہ کرام کی شان میں گستاخیاں اور افترا طرازیاں کرکے اپنے جذبہ بغض صحابہ رضہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ جس کی بنا پر حضرت مولانا محمد اسحق صاحب شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بجا طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"موصوف کی تازہ تالیف "خلافت و ملوکیت" نے تو نقاب تقیہ کو بالکل ہی پارہ پارہ کرکے موصوف کی سبائیت کو اظہر من الشمس کر دیا ہے۔ بلکہ اس کتاب میں جس خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ سبائیت کے تلخ زہر کو شیریں بنا کر ناواقفوں کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی اور اسے دیکھ کر اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ موصوف بلاشبہ سبائیت کے مجدد کے مرتبے پر فائز ہیں۔" (عادلانہ دفاع حصہ دوم صفحہ ۲۱۷)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب مرحوم و مغفور کے پُر مغز مقدمے سے چند اقتباسات درج کر دیئے جائیں :-

"مودودی صاحب نے حضرات صحابہ رضہ خصوصاً حضرت عثمان رضہ اور حضرت معاویہ رضہ کو انتہائی بے دردی کے ساتھ مجروح کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ملت اسلامیہ زندہ ہے اور ملت کے ایک فرزند برادرم حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری مودودی صاحب کی اس ایمان سوز "تفریح" کا مسکت جواب دیا ہے جس کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جواب تریاق ہے مودودی صاحب کے اس زہر قاتل کا جس سے پڑھے لکھے نوجوانوں کے اذہان و ایمان مسموم ہوتے۔ جن سادہ لوح اور علم دین سے بے خبر حضرات نے اس خود ساختہ مفکر اسلام اور مجدد عصر حاضر کے اس متجدد کے یہ زہریلے مضامین پڑھے ہیں۔ اگر وہ یہ جوابی تحریر پڑھ لیں گے تو انشاء اللہ صحابہ کرام رضہ اور خود دین اسلام کے خلاف اس جدید فتنہ سے محفوظ رہیں گے۔"

آخر میں شیعہ اخبار "رضا کار" لاہور مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۶۵ء سے ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں :-

"ترجمان القرآن کے تازہ شماروں میں "خلافت سے ملوکیت تک . . ." یہ مقالہ مودودی صاحب کے قلم سے

شائع ہوا ہے۔ مولانا نے اپنے اس مقالے میں صحابہ کرام پر ہی نہیں بلکہ ان کے سرخیل یعنی خلفائے راشدین پر بھی تنقید فرمائی ہے۔ اگر یہی تنقید ایک شیعہ کے قلم سے شائع ہوتی تو یقیناً صحابہ کرام پر سبّ وشتم قرار پاتی۔"

میری رائے میں اس کتاب کا تعارف اور اس پر تبصرہ اس سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ فی الجملہ مودودی صاحب کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے ورنہ انہیں صحابہ کرام پر سبّ وشتم کی یہ آزادی ہرگز نہ مل سکتی۔ کیا خوب کہا تھا اکبر الہ آبادی نے کہ

گورمنٹ کی خیر یارو مناؤ ۔۔۔ گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر ۔۔۔ انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ (س ح ج)

مسلمانوں کے عقائد اور افکار یعنی مقالات الاسلامیین

مؤلفہ علامہ امام ابوالحسن الاشعری رح

ترجمہ مع مقدمہ، حواشی اور اشاریہ حصہ اوّل از مولانا محمد حنیف صاحب ندوی : ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور : سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ۳۷۲ صفحات۔ کاغذ سفید، کتابت اور طباعت بہتر، مجلد مع رنگین ڈسٹ کور : قیمت نو روپے۔ ملنے کا پتہ : ادارہ مذکورۃ الصدر

مولانا محمد حنیف صاحب ندوی گذشتہ پچیس سال سے مسلسل معقولات اور منقولات کے وسیع میدان میں داد تحقیق دے رہے ہیں اور بلاشبہ انہوں نے پاکستان کے علمی حلقے میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے ان کو یہ امتیازی مقام ان کی حق پژوہی، صداقت پسندی، فراخدلی، وسعتِ نظر، عمق فکر اور بے تعصبی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ مثلاً وہ امام ابن تیمیہ رح کے متبع ہیں مگر شیخ اکبر رح کی عظمتِ شان اور جلالتِ فکر کے بھی معترف ہیں۔ شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کے بھی حامی ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کے علاوہ کانٹ اور ہیگل سے بھی آشنا ہیں۔ حدیث اور فقہ کے پہلو بہ پہلو فلسفہ اور علم کلام میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ابن خلدون، ابن تیمیہ اور امام غزالی پر بلند پایہ تصانیف شائع کرنے کے بعد ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ امام اشعری کی مایہ ناز تصنیف مقالات الاسلامیین کا شگفتہ ترجمہ ہے جسے انہوں نے ایک پُرمغز مقدمہ اور حواشی مفیدہ سے مزین کیا ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے حیات و کائنات، مذہب و فلسفہ، سائنس اور تصوف سے متعلق بہت سے علمی نکتے بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ زندگی کے لئے یقینیات مہیا کرنا یا ایسی قطعی بنیادوں کی نشان دہی کرنا جو تہذیب و تمدن کی تعمیر میں کام آئیں۔ فلسفہ کا کام نہیں بلکہ دین و مذہب کا فریضہ ہے۔ لیکن اس مقدمے کی جان وہ بحث ہے جس میں مولانا نے امام اشعری کی عظمتِ فکر اور دینی خدمات کو واضح کیا ہے۔ مقالات میں جسے افکار و نظریات کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیئے، امام صاحب رح نے چوتھی صدی ہجری کے ان تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے

بیان کر دیا ہے۔ جو صدیوں تک ہمارے یہاں فکری اور کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی سے کون کون سی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود (اپنی اصلی تعلیمات) کو قائم اور برقرار رکھا۔ بلاشبہ اس کتاب سے اردو زبان کے علمی ذخیرے میں بڑا قیمتی اضافہ ہوا ہے۔ (ی س ح)

حدیث ثقلین

مؤلفہ مولانا محمد نافع صاحب مدرس جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ۔

سائز $\frac{30 \times 20}{16}$، ۲۶۲ صفحات۔ کاغذ معمولی : کتابت گوارا، شائع کردہ دار التصنیف جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ : قیمت تین روپے

اس کتاب پر جو تقریظ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاول پور نے تحریر کی ہے وہ اس کتاب کا بہترین تعارف ہے اس لئے ہم ذیل میں اسی تقریظ سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔

"میں نے رسالہ "حدیث الثقلین" کو دیکھا جس میں اس روایت کے طرق اور اسانید کو جمع کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں صرف کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ بعض میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ذکر ہے۔ تیسری قسم وہ روایتیں ہیں جن میں بجائے سنت رسول صلعم کے لفظ اہل بیتی یا عترتی آیا ہے۔ اول اور دوم قسم کی روایتیں صحیح ہیں اور مؤید بالقرآن ہیں، کیونکہ قرآن میں جہاں اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول آیا ہے، اس میں فلاح بشری کے لئے صرف اطاعت کتاب اللہ اور اطاعت سنت رسول اللہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر دین میں کسی تیسری قسم چیز کی ضرورت ہوتی تو یہ ناممکن ہے کہ قرآن حکیم ایسے مواقع میں اس کا ذکر نہ کرتا بلکہ ایسے مواقع میں تمسک باہل البیت کو نظر انداز کرنا، فتح باب اضلال ہے جو قرآن کی شان ہدایت کے خلاف ہے۔ جن روایات میں لفظ عترت یا اہل بیت آیا ہے وہ روایۃً یا درایۃً درست نہیں۔

بہرحال رسالہ حدیث الثقلین میرے نزدیک اپنے موضوع میں بے مثال ہے اور دونوں فریق بشرط انصاف اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ (انتہیٰ بلفظہٖ صفحہ ۲۶ تا ۲۸) (ی س ح)

مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ مقدمہ و تعلیقات

از محمد عبد اللہ قریشی۔ تمہید و تعارف از جناب غلام رسول مہر۔ پیش لفظ از جناب ممتاز حسن : سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ۲۵۰ صفحات : طباعت ٹائپ، کاغذ سفید مجلد مع گرد پوش قیمت بارہ روپے : شائع کردہ اقبال اکیڈمی ۴۳ - ۲ ڈی بلاک ۶ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

یہ مکاتیب اس خوش ذوق اور خوش فکر شاعر کے نام ہیں جو اپنے دور میں کلاسیکی فارسی شاعری کے کامل الفن ادا شناسوں میں سے بلند مرتبے پر فائز تھا اور ان مکاتیب میں اقبال کی شاعرانہ حیثیت کے جو گوشے بے نقاب ہوئے

ہیں وہ غالباً کسی دوسرے مکتوب الیہ کے ساتھ مکاتیب میں واضح نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ دوسرے مکتوب الیہم میں سے بیشتر تو شاعر تھے ہی نہیں اور جو تھے تو ان کا ذوقِ شعری گرامی کے برابر نہ تھا۔

فاضل مرتب نے ان مکاتیب کے ایک ایک حصے کی توضیح کے لئے بیسیوں کتابوں، رسالوں، مقالوں اور تحریروں سے معلومات کے جواہر پارے فراہم کرکے نگینوں کی طرح جڑ دیئے ہیں تاکہ کوئی مطلب بغیر واضح نہ رہے۔ ان میں جن افراد اور وقائع کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق ضروری تفصیل اس حد تک مہیا کر دی ہے کہ صرف مطلب کے ذہن نشین کر لینے میں پڑھنے والوں کو سہولت رہے اور کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مکاتیب کا یہ مجموعہ اقبالیات کے سلسلے کا قابلِ قدر مرقع بن گیا ہے اور بلاشبہ اقبال اکیڈیمی کراچی نے اس مجموعے کو شائع کرکے علمی خدمت بھی انجام دی ہے اور شائقینِ کلامِ اقبال پر ایک احسانِ عظیم بھی کیا ہے۔　　(عکاس ت ح)

جمالِ عبدالناصر

مؤلفہ نذیر احمد خاں۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$، ۱۷۶ صفحات۔ کاغذ سفید کتابت اور طباعت بہتر۔ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت چار روپے

شائع کردہ: عوامی کتاب گھر، ملتان روڈ لاہور۔

مسٹر بدر الاسلام بٹ نے تعارف کے ذیل میں لکھا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں مصری فوج کے آزاد افسروں کی جس جماعت نے مصر میں بادشاہت کا تختہ الٹ دیا تھا اس جماعت کے رہنما کرنل ناصر تھے۔ اس انقلاب کے بعد مصر میں بہت سی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ سب سے پہلی ضرب جاگیرداری نظام پر پڑی جو عوام کی بدحالی کا ذمہ دار تھا۔ چونکہ رجعت پسند طبقات اپنے مکمل خاتمے کے بغیر اپنی شکست کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے مصری رجعت پسندوں نے اصلاحات کی شدید مخالفت کی۔ مگر صدر ناصر کی حکومت نے بروقت اقدام سے ان کی مزاحمت کا خاتمہ کر دیا۔ سامراجی غاصبوں اور ان کے رفقاء کے خلاف عربوں کی جدوجہد آج بھی جاری ہے جس میں متحدہ عرب جمہوریہ کو دنیائے عرب کے فعال ترین عنصر اور صدر ناصر کو عربوں کی آزادی کے نشان (SYMBOL) کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر کی شکست کی پوری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینے والا رہنما جب قوم سے اپنی سبکدوشی کی درخواست کرتا ہے تو پوری قوم اسے سبکدوش کر دینے سے کیوں انکار کر دیتی ہے۔　　(ق بس ت ح)

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں　　(اقبالؔ)

مقالاتِ شامِ ہمدرد

مرتبہ: حکیم محمد سعید

شامِ ہمدرد کی انجمن میں روشن ہونے والی وہ شمعیں ہیں جو پاکستان کے نادرۂ روزگار علماء، شعراء، سائنسدانوں، ماہرینِ تعلیم اور قانون دانوں نے روشن کی ہیں اور جن کی روشنی سے اردو زبان کے آفاق صدیوں تک منور رہیں گے ——

بڑے سائز کے ۳۰۰ صفحات　　قیمت: ——
آفسٹ طباعت ——　　کاغذی جلد ۷/۵۰
آرٹ پیپر پر ۲۰ تصاویر　　مجلد خاص ۱۵/-

—— ناشر ——

مکتبہ جدید　　۴۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور